جنوری 2003

ماہ نامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

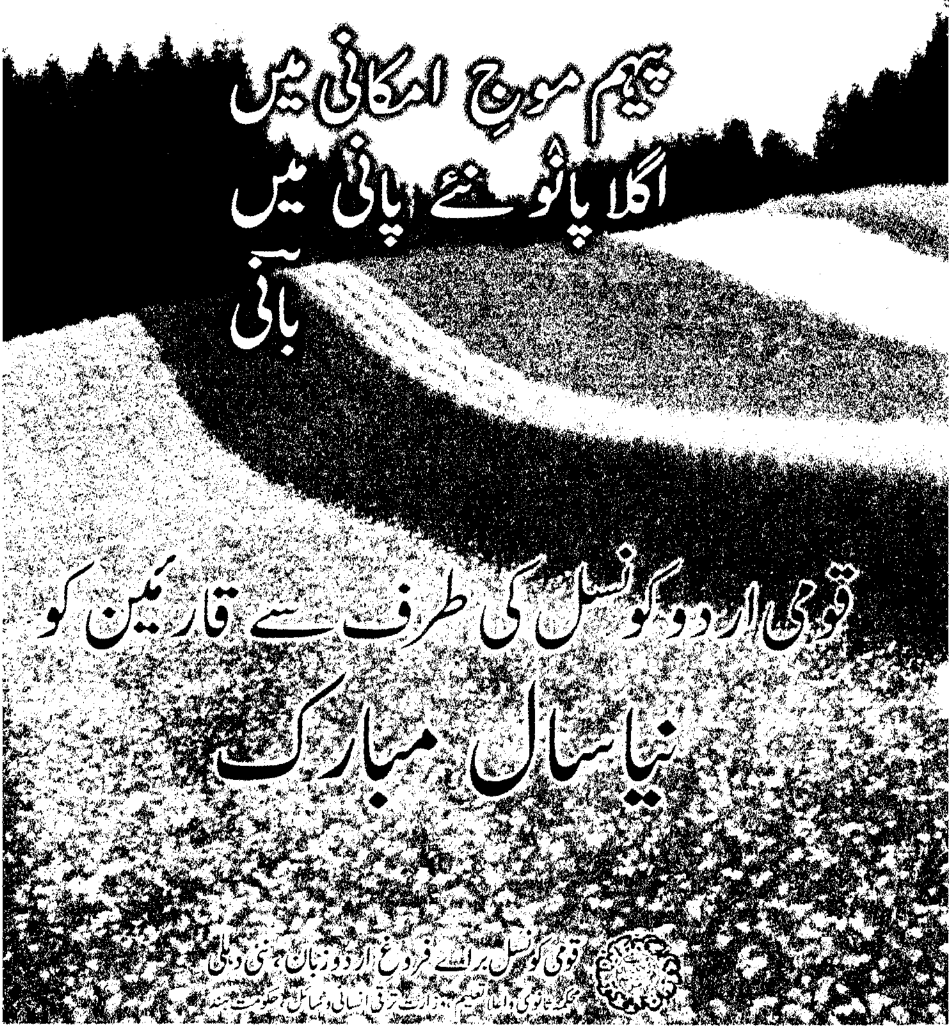

8/دسمبر 2002 کو وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کی رہائش گاہ پر عید ملن کی تقریب میں صدر جمہوریہ جناب اے۔ پی۔ جے۔ عبد الکلام،
جناب اٹل بہاری واجپائی اور مرکزی وزیر برائے شہری ہوا بازی جناب سید شاہنواز حسین۔

مولانا ابو الکلام آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک، راجستھان میں قومی اردو کونسل کی طرف سے چلائے جا رہے کمپیوٹر کورس کے طلبہ و طالبات کے
بیچ 02-2001 کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقعے پر اول پوزیشن حاصل کرنے والی طالبہ معراج سعید کو شیلڈ دیتے ہوئے جناب اروند مایارام
(سکریٹری محکمہ آرٹ اینڈ کلچر، حکومت راجستھان) اور محترمہ نسیم حسین (ڈپٹی سکریٹری، محکمۂ آرٹ اینڈ کلچر، حکومت راجستھان)۔

اس شمارے میں

آپ کی بات ..... خطوط 2
ہماری بات ..... اداریہ 7
ہندستانی زبانیں اور ہندی: داخلی رشتوں کی وضاحت (گیسٹ کالم) ..... وملیش کانتی ورما 8
● تعلیم میں اردو بولنے والوں کی لسانی ترجیحات: سماجی اور لسانی سروے ..... اوم کارناتھ کول 14
● عورتوں کے تئیں سماجی رویے — سماج کے حوالے سے ..... حسن عبداللہ 20
● بل گیٹس کا دورۂ ہند: مضمرات اور اثرات ..... معین الدین خاں 23
● تفتیشی صحافت — منفی اور مثبت [illegible] ..... [illegible] 25

خصوصی گوشہ
● اقلیتی تعلیمی اداروں سے متعلق سپریم کورٹ کا فیصلہ 27
● ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد ..... [illegible] محمود 30
● فیصلہ مسئلے کا قطعی حل نہیں ..... [illegible] خانہ والا 32
● سپریم کورٹ کا فیصلہ ..... [illegible] 34

گوشۂ ادب
● آبرو کے کلام میں گوالیاری [گوالیری] زبان کے [illegible] ..... وقار صدیقی 36
● قومی اردو کونسل کی طرف سے ادب اطفال کی پیشکش ..... کلیم اللہ 38

گوشۂ فروغ کتب
● بڑے بڑے کھیل اور بڑے بڑے تماشے (فسانۂ آزاد سے اقتباس) ..... رتن ناتھ سرشار 40
● جان کمپنی سے جمہوریہ تک جدید ہندستان کی کہانی (اقتباس) ..... مشیر الحسن 43

طلبہ کے لیے
● مائکروسافٹ ورڈ ..... عظیم صدیقی 47
● کوئز (اردو کی ادبی تحریکیں اور ادارے) ..... مخمور صدری 51
کتابوں کی موبائل وین آپ کے شہر، آپ کے گاؤں میں ..... ادارہ 54
اُردو خبرنامہ ..... ادارہ 56
تبصرہ و تعارف ..... کتابوں پر تبصرے 68
● معاشیات کے بنیادی اصول / سراج الحسن ..... مبصر: معین الدین خاں
● انوار سہیلی کی کہانیاں / ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی ..... مبصر: ملک راشد فیصل
● دیوانِ میر دوم (عکسی) / نجے گوڑبولے ..... مبصر: سرور الہدیٰ
● سردار جعفری کے خطوط / ڈاکٹر خلیق انجم ..... مبصر: عبدالرب
● عبدالقوی دسنوی: ایک مطالعہ / ڈاکٹر محمد نعمان، کوثر صدیقی ..... مبصر: ظفر احمد نظامی
● ارمغانِ سرور / پروفیسر اصغر عباس ..... مبصر: محمد خالد
● کلیاں اور پھول / ڈاکٹر منوہن طالب ● نگارشات / عزیز کاشمیری
● پیاری سی پہاڑی لڑکی / یوہانا شبیری ● خرخوں کا مشاعرہ / نصرت ظہیر
● مرشد آباد کی ایک نایاب مثنوی ہر مزنامہ / ڈاکٹر محمد ہاشم ● کوکن کی خوشبو / ساحر شیوی
● اصغر ویلوری — فن اور شخصیت / پروفیسر محمد علی اثر ● ہم وطن / سعید احمد سندیلوی

بچوں کا گوشہ
● ابوالکلام آزاد ("ہمارے رہنما" سے اقتباس) ..... ایس. جی. حیدر 75

National Council for Promotion of Urdu ★ New Delhi
ACC No. 5170
15/10/04

ماہنامہ
اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔5، شمارہ۔1: جنوری 2003

قیمت -/10 روپے سالانہ -/100 روپے

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: ارجمند آرا

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمۂ تعلیم۔ حکومتِ ہند

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110
فون: 6103381، 6103938
6179657 فیکس: 6108159
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد
دہلی۔110006

مقام اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک۔8، ونگ۔7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 6109746

شاخ: 5-4-4/435/20، گرین ہاؤس،
اسٹیشن روڈ، نام پلی، حیدر آباد 001 500 (A.P.)
فون: 4615139

آپ کی بات

■ ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد، 25-A، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں توی، جموں و کشمیر-180004

راقم التحریر چونکہ قومی اردو کونسل کا رکن ہے اس لیے اس کے قلم سے ماہنامہ ''اردو دنیا'' اور سہ ماہی ''فکر و تحقیق'' کی تعریف اچھی نہیں لگتی۔ لوگ کہیں گے یہ اپنی آرگنائزیشن کی تعریف کر رہا ہے۔ حالانکہ میں دل سے محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے ان جرائد کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے اور کن لفظوں میں تعریف کروں کہ میں ان دونوں جرائد کی باقاعدہ فائل رکھتا ہوں۔

ان جرائد کے علاوہ بھی اردو کے فروغ کے لیے آپ کی زیرِ نگرانی قومی کونسل جو کام کر رہی ہے، آنے والی نسلیں اسے ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ میں 1989 سے ترقی اردو بورڈ کا رکن چلا آرہا ہوں۔ کبھی ایگزیکیٹو کمیٹی کا اور کبھی اسٹینڈنگ کمیٹی کا۔ ترقی اردو بیورو اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے کام میں زمین و آسمان کا فرق نظر آرہا ہے۔ جزاک اللہ!

الٰہی بختِ تو بیدار بادا!

■ ڈاکٹر ہاشم قدوائی، 107، ساچار اپار ٹمنٹس، میور وہار، نئی دہلی-91

''اردو دنیا'' پابندی سے آرہا ہے۔ اس کے معیاری اور تحقیقی مضامین قابلِ صد ستائش ہیں لیکن بہتر یہی ہوگا کہ اس میں اختلافی مضامین چھاپنے سے احتراز کیا جائے اور کسی مضمون میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو واقعات اور حقائق کے خلاف ہو یا اس سے اختلاف کا دروازہ کھلتا ہو۔ ڈاکٹر رفیق زکریا کا مضمون ''ہندستانی مسلمان کدھر؟'' اور ''سرسید احمد خان اور اجتہاد'' اسی ذیل میں آتے ہیں۔

■ نامی انصاری، 99/295، تالہ روڈ، چمن گنج، کان پور-208001

اردو دنیا میں کالی داس گپتا رضا کے حوالے سے، ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری اور پروفیسر ایس. ایم. ایچ رضوی کے استفسارات اور شبنم آرا کی وضاحت کے سلسلے میں، جن تین شعروں کی بات آئی ہے، ان سے متعلق میں ''سہو سراغ'' مطبوعہ جنوری 1980 (مرتبہ: صابردت) سے وہ پوری عبارت نقل کر دیتا ہوں جو رضا صاحب نے ان شعروں کی بابت تحریر کی ہے تاکہ متعلقہ حضرات اور دوسرے لوگ بھی صحیح صورتِ حال سے واقف ہو جائیں:

مضمون کا عنوان ہے ''چند مشہور شعر اور ان کے خالق۔''

''تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

شریف العلماء مولوی شریف حسین جو حیدرآباد میں ناظم عدالت تھے، 21 مارچ 1871 کو اپنے بھائی کو لکھتے ہیں:

''میر انیس صاحب کے پاس اکثر بیٹھتا ہوں۔ میر انیس نے میر تقی کے دو شعر پڑھے.... ''ان دو میں سے ایک شعر وہی تھا جو اوپر بیان ہوا ہے۔

''سریلی بانسری'' مجموعہ کلام آرزو لکھنوی کے پہلے ایڈیشن 1938 کے دیباچے میں مشہور افسانہ نگار، سید علی عباس حسینی فرماتے ہیں کہ آرزو صاحب کے شاگرد اخگر صاحب نے آرزو صاحب کو لکھا کہ میر تقی میر کا یہ شعر ''تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو رونا ہے، یہ کچھ ہنسی نہیں ہے'' جس زبان میں کہا گیا ہے (یعنی خالص اردو میں جس میں عربی، فارسی کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ ن۔ا) اس میں آپ پوری غزل لکھیے۔ آرزو صاحب نے پوری غزل لکھ ڈالی۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی صاحب نے بھی سنا۔ انھوں نے آرزو صاحب سے فرمائش کی کہ اس زبان میں سو غزلیں کہیے۔

مندرجہ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ 1871 میں یہ شعر میر تقی میر سے منسوب تھا بلکہ میر انیس سے لے کر آج کے مشاہیر تک اسے میر تقی میر ہی کا شعر مانتے آئے ہیں، حالانکہ یہ بات حقیقت سے کوسوں دور ہے۔ یہ شعر بدھ سنگھ قلندر کا ہے جو خان آرزو (وفات 56-1755) کے معاصرین میں سے تھے۔ اصل شعر یہ ہے:

تھمتے تھمتے تھمے گا اشک ناسخ
رونا ہے، یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

اس غزل کا مطلع بھی سن لیجیے:

جی کو میر زندگی نہیں ہے
کیا جی کے کروں کہ جی نہیں ہے

ملاحظہ کیجیے، طبقات الشعرائے ہند، کریم الدین (1847)، ص 79۔ یہ نہایت کمیاب تذکرہ میرے کتب خانے میں موجود ہے۔''

(سہو سراغ، ص۔ 129)

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

یہ شعر میر تقی میر کے نام سے مشہور ہے بلکہ ان کے ایک قلمی نسخے میں بھی (اب چھپ گیا ہے) موجود ہے، تاہم حقیقت یہ ہے کہ شعر بالا جی ترمبک ناتک ذرہ برہانپوری کا ہے۔ میر 1810 میں فوت ہوئے جبکہ ذرہ کا

سال وفات 1785 تسلیم کیا جاتا ہے۔ مزید بر آں یہ شعر ذرّہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کلیات میں شامل ہے جو کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد کی زینت ہے۔ (اس کی ایک ہو بہو نقل میں نے ڈاکٹر شیخ فرید کے یہاں دیکھی تھی۔ مرقعِ سخن، جلد دوم ص۔54)۔(سہو سراغ۔ ص131)

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار
جب کبھی گردن جھکائی دیکھ لی

یہ شعر موجی رام موجیؔ، خلف دیوان چھترپت لکھنوی، ملازم امیر الملک نواب حسن علی خاں، خلفِ سعادت علی خاں کا ہے۔ موجیؔ، مصحفیؔ کے شاگرد تھے مگر خود بھی استاد صاحبِ تلامذہ تھے۔ اس غزل کا مطلع بھی کم مشہور نہیں ہے

وصل بھی دیکھا جدائی دیکھ لی
حق نے جو صورت دکھائی دیکھ لی

(سہو سراغ ص132)

ضمناً یہ بھی عرض کردوں کہ شبنم آرا نے اپنے وضاحتی بیان میں لکھا ہے کہ "سہو سراغ" ناشر نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے مارچ 1966 میں شائع ہوئی ہے، جو صحیح نہیں ہے۔ ش۔ک۔ نظام نے اپنے مضمون میں اشاعت کی یہ بات "معرکہ چکبست و شرر" کے لیے کہی ہے نہ کہ 'سہو و سراغ' کے لیے۔ 'سہو و سراغ' کے مرتب صابر دت ہیں اور انھی نے یہ کتاب جنوری 1980 میں یونیورسل پریس، ممبئی میں چھپوا کر شائع کی تھی۔ راقم الحروف کے پاس یہ کتاب موجود ہے جو خود اس کے مصنف، کالی داس گپتا رضا کی عطا کردہ ہے۔ امید ہے کہ اب اس سلسلے میں مزید کسی غلط فہمی کا امکان نہیں رہے گا۔

اب یہ بحث ختم کی جارہی ہے۔ (ادارہ)

■ ڈاکٹر نیاز سلطان پوری، مسیح پبلی کیشنز، بھٹی جرولی، پوسٹ کٹاواں، سلطان پور، یوپی۔ 228001

نومبر-2002 کا شمارہ بدست ہوا۔ سرورق پر بانیِ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سر سید احمد خاں مرحوم کی تصویر بڑی ہنرمندی کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ ڈاکٹر رفیق ذکریا صاحب کا مضمون "ہندستانی مسلمان کدھر؟" باوزن اور وقیع ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں بہت ہی کارآمد باتیں بیان کی ہیں۔ "سر سید اور اجتہاد" بھی عمدہ اور فکر انگیز مضمون ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن نے اپنے مضمون "بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا ایک پہلو" میں ہند مغل جمالیات کی بازیافت کی ہے جو ایک مستحسن قدم ہے۔ ویسے ڈاکٹر صاحب ہندستانی جمالیات پر اتھارٹی ہیں اور اُن کا ہندستانی جمالیات سے متعلق ہر مضمون دلچسپ، معلومات افزا اور پُر مغز ہوتا ہے۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار اور پروفیسر مشیر الحسن کی کتابوں کے اقتباسات بہت پسند آئے۔ فسانۂ آزاد سے اقتباس کے لیے دو تین صفحات کا مزید اضافہ کریں اور آئندہ بھی اسی طرح کی کلاسیکل کتابوں کے اقتباس "اردو دنیا" میں شائع کرنے کا اہتمام کریں۔

جون کے مہینے میں برادرم وی صدیق موبائل گاڑی لے کر آئے تھے، راقم الحروف نے وقت دے کر اہالیِ سلطان پور کو کتابوں کی خریداری کے لیے ترغیب دلائی۔ نتیجتاً بڑی تعداد میں کتابوں کی خریداری ہوئی۔ ایک چھوٹی سی جگہ سے اتنی تعداد میں کتابوں کا فروخت ہو جانا تاریخی واقعہ ہے۔ آئندہ کبھی اس قسم کا پروگرام مرتب کیا جائے تو راقم الحروف کو ضرور مطلع فرمایا جائے۔ کونسل کی کتابوں کے تئیں عام قارئین کا تاثر یہ ہے کہ اب کونسل کی کتابیں پہلے کی بہ نسبت کافی مہنگی ہو گئی ہیں، ازراہِ کرم اس جانب بھی توجہ مبذول فرمائیں۔[1] محترم نارنگ صاحب ایک نظریہ ساز اور اہم نقاد ہیں اور بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ اُن کی تنقیدی آرا دقّتِ نظر، تبحرِ علمی اور ادبی بصیرت کی حامل ہوتی ہیں۔ اس وقت پوری اردو دنیا میں موصوف جیسی قد آور شخصیت چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملے گی۔ راقم الحروف کی رائے میں اُن کی کتابوں کا مکمل سیٹ نہایت ارزاں قیمت پر محبانِ اردو کو مہیا کرایا جائے۔[2] بہن ارجمند آرا کا مضمون خاصا دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ اُن کا ایک ترجمہ کردہ مضمون (جو رالف رسل کے مضمون کا ترجمہ ہے) "شاعر" نومبر 2002 میں شائع ہوا ہے جو اردو تحریک سے متعلق کافی معلومات افزا اور چشم کشا ہے۔ لندن میں بیٹھے ہوئے اس شخص نے حقائق پر مبنی مضمون سپردِ قلم کرکے تعمیری کام کیا ہے۔ صاحبِ مقالہ اور مترجمہ کو اس کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔ دراصل یہ مضمون "اردو دنیا" میں شائع ہونا چاہیے تھا۔

(1)- کونسل کی کتابیں حسبِ سابق واجبی قیمتوں پر ہی شائع کی جارہی ہیں، قیمتوں میں اگر کچھ اضافہ نظر آتا ہے تو وہ کاغذ، طباعت، بائنڈنگ وغیرہ کے نرخ بڑھ جانے کی وجہ سے ہے۔

(2)- محترم نارنگ صاحب کی کئی کتابیں کونسل نے شائع کی ہیں۔ (ادارہ)

■ مجید سامون، گریز، کشمیر

"اردو دنیا" باقاعدگی سے موصول ہو رہا ہے اور یہ جریدہ میں شوق سے پڑھتا ہوں۔ اکتوبر 2002 کے شمارے میں اطہر فاروقی کا مضمون "مسلمانوں کی ترقی کے لیے اسلام کی تشریحِ نو لازمی ہے" بہت پسند آیا۔ انھوں نے صحیح لکھا ہے کہ "عام مسلمان کے طرزِ فکر میں تبدیلی تب ہی ممکن ہے جب ہندی مسلمان معقول طور پر تعلیم یافتہ ہوں" یقیناً اس تبدیلی کے لیے طویل عرصہ درکار ہے کیوں کہ مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی لیڈر شپ، آج تک انھیں

ترقی کے مرکزی دھارے کا حصہ بنانے میں ناکام رہی ہے۔

اطہر فاروقی صاحب نے بہت اچھی بات کہی ہے کہ "شریعت کے کئی ایسے پہلو جو مسلم پرسنل لا کا حصہ ہیں، تشریح نو کے متقاضی اس لیے ہیں کہ وہ عصر حاضر کے ہندستان میں مسلمانوں کی عملی زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ چونکہ پرسنل لا کی ہندستانی شکل انگریزوں کا تحفہ ہے اور ایک آزاد مملکت کے تقاضوں کے پیشِ نظر بعد میں اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں کی گئی۔" اطہر صاحب کی یہ بات بھی بالکل سونی صد صحیح ہے کہ "مذہبی فریضوں کو لے کر کبھی کوئی تنازعہ کھڑا نہیں ہوتا کیوں کہ یہ اسلام کے وہ بنیادی اجزا ہیں جن سے دوسرے عقیدے کے لوگوں کو کوئی غرض نہیں لیکن وہ قوانین جن میں مسلمان یقین رکھتے ہیں اور جن کا تعلق ان دنیاوی معاملات سے ہے جو غیر مسلم ہم وطنوں کے ساتھ مسلمانوں کے رشتے کو متاثر کرتے ہیں، ان کی وقت سے ہم آہنگ تشریح نو کی اشد ضرورت ہے۔"

■ ضیاء جعفر، 8 نمبر اسٹریٹ، کمبل پوش روڈ، بنگلور-51 (کرناٹک)

نومبر کا شمارہ نظر سے گزرا، سب سے پہلے "ہماری بات" میں مسلمانوں کی عمومی پس ماندگی اور مدارس سے وابستہ مسلمانوں کے رول کے حوالے سے ایک اضطراب کی سی کیفیت کے بارے میں لکھا گیا ہے اور اس کے تدارک کے لیے جو مفید مشورے بھی دیے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ —"مدارس کو اپنے طرز تعلیم اور طرز معاشرت میں اتنا کھلا ضرور ہونا چاہیے کہ دوسرے مذہبی فرقوں کے لوگ ان کے موقف سے واقف رہیں۔"

محترمہ ارجمند آرا نے "عورتوں کے تئیں سماجی رویے۔۔۔۔" مضمون میں عورتوں کی پامالی کے بارے میں اور پھر دہلی میں آبروریزی کے حالیہ حادثات کی صحیح تصویر کھینچی ہے۔ آج عورتوں کے تحفظ کے لیے صرف کاغذی کارروائی ہو رہی ہے۔ اگر کوئی ٹھوس قدم یا پھر "سخت قانون" بنایا جائے تو عورتوں کی حفاظت ہو سکتی ہے۔

محترم ظفرالاسلام اصلاحی نے "سرسید اور اجتہاد" میں ان کے نظریے اور اجتہادی فکر کے بارے میں بہت ساری باتیں بتائی ہیں۔ ان کا سیدھا سادہ نقطہ نظر یہ تھا کہ مسائل کے حل کے لیے قرآن و حدیث سے رجوع کیا جائے۔ ان کی ہدایت یہ تھی کہ اصولی تعلیمات کی روشنی میں جو بات واضح ہو اس پر عمل کیا جائے خواہ وہ کسی مسلک کے مطابق ہو۔" "جان کمپنی سے جمہوریہ تک جدید ہندستان کی کہانی" کی چوتھی قسط پڑھی، پرانی یادیں تازہ ہو گئیں، ویسے تاریخ دلچسپ ہوا کرتی ہے، مشیر الحسن نے اسے سحر انگیز بنا دیا ہے!

■ حمید اشرف خان، صدر مولانا آزاد پبلک لائبریری،
ملکاپور، ضلع بلڈانہ، مہاراشٹر

آپ کا مایۂ ناز جریدہ "اردو دنیا" نومبر 2002 ملا۔ یہ پرچہ واقعی اردو کی صحیح خدمت انجام دے رہا ہے۔ میں گذشتہ 2 ماہ سے پڑھ رہا ہوں۔ ہم لوگ ملکاپور میں مولانا آزاد پبلک لائبریری گزشتہ چالیس سال سے کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں۔ محدود وسائل کے باوجود اردو، انگریزی، مراٹھی، ہندی کی دس ہزار کتب کا قیمتی سرمایہ یہاں موجود ہے، تمام رسائل بھی آتے ہیں۔

سرکاری امداد حکومتِ مہاراشٹر کے محکمۂ لائبریریز سے ملتی ہے جو محدود ہوتی ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کتابی امداد سے لائبریری کا ذخیرہ بڑھ رہا ہے۔ اسی طرح ہندی انگریزی کی کتابوں کی فراہمی راجہ رام موہن رائے فاؤنڈیشن، کلکتہ سے بڑی تعداد میں ہوتی ہے۔ امید کہ آپ کا تعاون اسی طرح شامل حال رہا تو لائبریری اپنی خدمات اور عمدہ طریقے سے ادا کر سکے گی۔

ڈاکٹر رفیق زکریا کا مضمون پڑھا لیکن آپ کی تجاویز پر کہاں تک مسلمان دھیان دیں گے اور ہندتو وادی ادارے مسلمانوں کو کہاں تک قریب آنے دیں گے یہ تو وقت ہی بتلائے گا۔ شاید آج کی سیاسی بنیاد ہی نفاق پر ہے۔ خیر، ہندستانی ثقافت کی شناخت جتنی گہرائی سے آپ نے کی ہے، یہ آپ کا ہی حصہ ہے۔ محترم ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کا فرمان کہ مسلم قوم خود کو اقلیت کیوں تصور کرتی ہے، اس حوصلہ افزائی کے لیے شکریہ! کاش دیگر اکابرین بھی اس حقیقت کو سمجھ لیں تو دیش اس منجدھار سے نکل جائے اور ترقی کرے۔

■ قمر رضا نقوی، ایڈیٹر "بازگشت" اردو ویکلی، امروہہ

ماہ نومبر 2002 کا "اردو دنیا" باصرہ نواز ہوا۔ "تھی جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں" اب یہ جستجو ختم ہو گئی ہے اور ماہنامہ "اردو دنیا" بہترین جریدے کے طور پر خود کو پیش کرنے میں کامیاب رہا ہے جس کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ زیرِ نظر شمارے میں خاص طور پر گیسٹ کالم کے تحت "ہندستانی مسلمان کدھر؟" اور "سرسید اور اجتہاد" فکر انگیز مضامین ہیں۔ ان کے علاوہ رپورٹ "بڑھتی آبادی اور ماحولیاتی تبدیلیاں" معلوماتِ عامہ میں اضافے کا ذریعہ ہے۔ "بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا ایک پہلو" تہذیبی اور ثقافتی معلومات بہم پہنچاتا ہے۔

مختصر یہ کہ زیرِ نظر شمارہ علمی، ادبی، تاریخی، ثقافتی تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ترقی اردو کے لیے اہم کام انجام دے رہی ہے۔

■ درخشاں زریں، ریسرچ اسکالر شعبۂ اردو، پٹنہ یونی ورسٹی، پٹنہ

سب سے پہلے تو میں اردو زبان سے آپ کے بے انتہا خلوص اور فعال کوششوں کے لیے دلی مبارک باد دیتی ہوں۔ پچھلے دنوں انھیں کوششوں کی ایک جھلک ہمیں پٹنہ (بہار) میں بھی دیکھنے کو ملی جب میری نظر اردو کتابوں

کی موبائل وین پر پڑی تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ وین میں لگائی گئی کتابوں کی ترتیب و تزئین اور متعلقین کی حسنِ کارکردگی اور خلوص و اپنائیت نے خریدنے والوں کو خاص طور سے اپنی جانب متوجہ کیا۔ لوگوں نے اپنی اپنی پسند کی بے شمار کتابیں خریدیں خصوصاً ہمارے پٹنہ یونی ورسٹی، شعبۂ اردو کے طلبہ و طالبات نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

یہاں پر ایک بات کی جانب میں آپ کو متوجہ کرنا چاہوں گی کہ دور دراز کے شہروں سے وین کے آتے آتے اس میں کتابوں کا بہت سارا اسٹاک ختم ہو چکا تھا جن کی ہمارے طلبہ و طالبات کو ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں مختصر اردو لغت، اصنافِ ادب اور تنقید کا اسٹاک بھی کم تھا۔ اگر آئندہ ان باتوں کا خیال رکھا جائے اور کتابوں کے اسٹاک زیادہ ہوں تو خریدنے والوں کو اور زیادہ سہولت ہوگی۔

"اردو دنیا" میں تو ہمیں اردو زبان اور سائنس و ٹکنالوجی سے متعلق بڑے پُر مغز مقالات و مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں مگر اردو ادب کا گوشہ کچھ ماند ماند سا لگتا ہے جس کی جانب مزید توجہ دی جائے تو بہتر ہوگا۔

■ عبدالقیوم، کنوینر سرسید مسلم انسٹی ٹیوٹ، بھروٹ، جموں و کشمیر

ماہنامہ "اردو دنیا" پچھلے دو سال سے برابر زیرِ مطالعہ ہے۔ مجھے ہر ماہ بے چینی رہتی ہے۔ "اردو دنیا" ہر قسم کے مضامین سے لبریز ہے اور ہر پیاسے کی پیاس بجھاتا ہے۔ اس میں ہر قسم کے مضامین، اطلاعاتی، معاشی، سماجی، صحافتی، کمپیوٹر، سافٹ ویئر، بچوں کا گوشہ، کیریئر گائیڈنس اور تعلیمی جلا بخشنے والے موضوعات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ اردو ادب کو نئی جہت پر لے جائے گا۔ "اردو دنیا" کی وجہ سے زبان کو جو فروغ حاصل ہوگا وہ آپ کی طرف سے اردو کے لیے بے لوث خدمت ہوگی۔

■ عبدالغفار، اردو ٹرسٹ، 37، ہیزل ووڈ لین، لندن - N13 3EZ

"اردو دنیا" کے تین شمارے بابت جون، جولائی اور ستمبر نظر نواز ہوئے تمام شمارے حسبِ دستور اعلا تعلیمی، ادبی، تحقیقی و اقتصادی اہمیت اور افادیت سے معمور مشمولات پر مبنی ہیں۔ ان شماروں میں اردو کے مسائل اور اس کی ترقی و ترویج سے متعلق مضامین لائقِ صد تحسین و آفریں ہیں۔ مرحوم کیفی اعظمی (جون 2002) کو جائزہ اور بھرپور خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ضمن میں مضامین اور خاکے حق ادا کر دیتے ہیں۔

■ اے. این. شبلی- C-82/A، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی-25

نومبر کے شمارے میں پروفیسر اکبر رحمانی کے انتقال کی خبر پڑھ کر افسوس ہوا، موصوف کو میں چار پانچ سال سے جانتا تھا۔ 1999 میں اتر پردیش کاروانِ صحت کے دوران میں مرحوم کے ساتھ لگ بھگ دس دنوں تک رہا، اس دوران ان سے مجھے کافی کچھ سیکھنے کو ملا۔ صحت اچھی نہ ہونے کے باوجود انھوں نے کارواں میں نہ صرف شرکت کی بلکہ جہاں بھی ان سے گزارش کی گئی، انھوں نے تقریر بھی کی۔ مرحوم تعلیم کے تعلق سے ایک رسالہ "آموزگار" نکالتے تھے۔ اس رسالے کے بارے میں انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اس رسالے سے انھیں کوئی بھی مالی فائدہ نہیں ہے۔ وہ اس بات پر افسوس جتاتے رہے کہ مسلمان رسالے خرید کر نہیں پڑھتے۔ اردو کی خدمت کرنے کو سب تیار ہیں، اس کے لیے خرچ کرنے کو کوئی تیار نہیں۔ مرحوم کے لیے خدا سے دعا گو ہوں کہ خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

■ محمد سمیع اللہ خان باز، صدر، اردو ملاپ سوسائٹی، کرناٹک-577214

"اردو دنیا" کے قارئین سے گزارش ہے کہ آپ اپنے آس پاس یہ اعلان کروائیں کہ اردو جاننے والے گھرانے ہر روز اردو کا ایک روزنامہ، ایک ہفت روزہ، ایک پندرہ روزہ اور ایک ماہانہ رسالہ خریدیں تاکہ اردو کی کساد بازاری دور ہو۔ کیا آپ کے پاس چائے کے لیے پیسے ہیں اور اپنی زبان کے لیے نہیں! تعجب ہے!! مہاراشٹر کے اردو عوام سے گزارش ہے کہ ممبئی کے 4 تا 12 / جنوری کے کتاب میلے سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ منتظمین کو پیشگی مبارک باد۔

■ ڈاکٹر منہاج الدین، L2/151، وی آئی پی ایریا، شہید نگر، آگرہ، یوپی

"اردو دنیا" ہر ماہ خرید کر پڑھتا ہوں، آپ کا رسالہ واقعی اردو کی دنیا میں دھوم مچا رہا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے یہ طالبِ علموں کا پسندیدہ پرچہ ہے۔ مخصوص طور سے کمپیوٹر کے طالب علموں کے ہاتھ میں زیادہ دیکھنے کو ملتا ہے۔

■ ایچ محمد یاسین، سوپور

"اردو دنیا" میں پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ سائنس اور تحقیقی موضوعات پر مضامین کی اشاعت کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ آپ کا کیریئر گائیڈنس بھی بے حد معلوماتی ہے۔ بعض مختصر کہانیوں نے رسالے کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔

■ محمد عمران راعینی، محلہ شیخ سرائے، پرانا سیتاپور یوپی-261001

ماہ نامہ "اردو دنیا" نومبر 2002 بہت اچھا لگا۔ "چلو میں اُلّو" پڑھا، بے حد دلچسپ لگا۔ شبنم آرا کا کوثر "قدیم عہد میں عورت" دلچسپ معلومات بہم پہنچاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی کی یہ کاوش قابلِ ستائش ہے۔

□□□

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ایک اور گراں قدر تنقیدی و تحقیقی کتاب
شائع ہوگئی ہے

اردو غزل اور ہندستانی ذہن و تہذیب

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے سارے گوشوں پر نظر رکھتے ہیں۔

آل احمد سرور

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے ادبی مطالعہ کے ایک نئے زاویے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شعر و ادب ملکی تہذیب کی پوری تصویر بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی سعی و جستجو سے اس مطالعہ کے لیے زمین ہموار ہوگئی ہے ...

سید احتشام حسین

گوپی چند نارنگ اردو کے مزاج داں ہیں اور کلاسیکی ادب پر ان کی نظر گہری ہے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اردو شاعری کے دیسی عناصر پر اتنی تحقیق کی ہے اور اس مضمون کے ہر پہلو کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ ان کو اس مضمون کا ماہرِ خصوصی سمجھنا چاہیے۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب

صفحات : 464 قیمت : 250 روپے

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

ویسٹ بلاک ۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

ہماری بات

31 اکتوبر کے اپنے ایک اہم فیصلے میں سپریم کورٹ نے اقلیتوں کے ذریعے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کے آئینی حق (دفعہ 30(1) کے تحت) کی تشریح نو کی ہے۔ اس فیصلے میں عدالتِ عالیہ نے اقلیتی تعلیمی اداروں کے انتظام و انصرام کو آئین کی دفعہ 29(2) کے ساتھ وابستہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ سرکاری امداد یافتہ اقلیتی اداروں کو کچھ نہ کچھ سرکاری اصول و شرائط کا پاس رکھنا ہوگا۔ یہ بات غور طلب ہے کہ آئین کی دفعہ 29(2) کے مطابق حکومت سے مدد لینے والے کسی بھی ادارے میں ذات، مذہب اور زبان کی بنیاد پر کسی طرح کا بھید بھاؤ کسی بھی شہری کے ساتھ نہیں برتا جاسکتا۔ اس دفعہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہی عدالت نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ اقلیتی تعلیمی اداروں کو اپنی شرائط پر طلبہ کو داخلہ دینے اور انتظام سنبھالنے کی آزادی صرف اسی صورت میں حاصل ہوگی جب وہ سرکاری امداد نہ لیتے ہوں۔ امداد قبول کرلینے کی صورت میں ان اداروں کا درجہ تو نہیں بدلے گا لیکن انھیں ایک مخصوص تعداد میں غیر اقلیتی طلبہ کو داخل کرنا پڑے گا جس کا تعین مقامی ضرورتوں کے پیشِ نظر متعلقہ ریاستی سرکاریں کریں گی۔

عدالتِ عالیہ نے یہ بات بھی واضح کردی ہے کہ سرکاری امداد نہ لینے والے اقلیتی ادارے گو کہ وسیع تر حقوق کے حامل ہوں گے تاہم ان کے تعلیمی معیار اور منظوری کے اصول و ضوابط دیگر اداروں سے مختلف نہیں ہوسکتے۔ یعنی تعلیمی معیار کا پیمانہ حکومت کے منظور شدہ بورڈوں اور یونیورسٹیوں کے مطابق ہو اور اسی کے مطابق وہ تسلیم شدہ بھی ہوں؛ فیس کا تعین اقلیتی ادارے اپنی مرضی سے کرتو سکتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی ادارہ کیپی ٹیشن (Capitation) فیس لینے کا مجاز نہیں ہے؛ داخلہ دینے کے طریقے وہ خود طے کرسکتے ہیں لیکن ان میں شفافیت ہو وغیرہ وغیرہ۔ اعلیٰ تعلیم اور پروفیشنل تعلیم کے اداروں میں داخلے کے لیے اہلیتی امتحان کی پابندی بھی عدالت نے عائد کردی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ریاستی حکومتیں ایسے اداروں کے اساتذہ اور پرنسپل حضرات کی اہلیت کا کوئی پیمانہ متعین کرسکتی ہیں۔

اس فیصلے کے اثرات دوررس اور نتیجہ خیز ہوں گے کیونکہ ایک طرف تو عدالت نے غیر امداد یافتہ اقلیتی تعلیمی اداروں کی خاصی آزادی کو برقرار رکھا ہے لیکن دوسری طرف سرکاری امداد حاصل کرنے والے اداروں پر خاصی پابندیاں عائد کرتے ہوئے سرکاری کنٹرول کو بڑھایا ہے۔ خصوصاً اعلیٰ تعلیم کے اقلیتی اداروں کے حوالے سے یہ فیصلہ اس لیے اہم ہے کہ بیشتر ادارے سرکاری امداد لیتے ہیں۔ عدالت کے اس فیصلے پر سینٹ اسٹیونز جیسے اقلیتی ادارے جہاں اس بات پر مطمئن ہیں کہ سرکاری امداد لینے یا نہ لینے دونوں صورتوں میں اقلیتی اداروں کا وہ اسپیشل اسٹیٹس جو آئین کی دفعہ 30(1) کے تحت انھیں حاصل ہے، برقرار رہے گا وہیں اس بات سے وہ پریشان خاطر بھی ہیں کہ امداد یافتہ اداروں میں غیر اقلیتی طلبہ کے داخلے کی تعداد متعین کرنے کا اختیار ریاستی حکومتوں کو دے کر عدالت نے ان اداروں کی خود مختاری کو بہت کم کردیا ہے۔

ان اندیشوں کے علاوہ اور بھی کئی سوال تھے جن کا جواب آئینی بنچ نے اس فیصلے میں دیا ہے۔ مثلاً 'اقلیت' کی تعریف بیان کرتے ہوئے عدالت نے مذہبی یا لسانی اقلیت کا فیصلہ متعلقہ ریاست کی آبادی کی صورتِ حال سے وابستہ کردیا ہے۔ یعنی کشمیر، میزورم اور پنجاب جیسی ریاستوں میں ہندو اقلیتی درجے کے حامل ہوں گے اور ان ریاستوں میں ہندوؤں کے ذریعے قائم تعلیمی اداروں کو وہی حیثیت حاصل ہوگی جو ہندو اکثریتی علاقوں میں دوسری مذہبی یا لسانی اقلیتوں کو حاصل ہے۔

لیکن جس سوال کا عدالت نے کوئی جواب نہیں دیا ہے وہ مذہب سے متعلق ہے۔ سوال یہ تھا کہ کیا اکثریتی فرقے کے مذہب کا کوئی مسلکی طبقہ اقلیتی اسٹیٹس حاصل کرنے کا دعویٰ کرسکتا ہے؟ عدالت نے اس سوال کو فیصلے سے الگ رکھا ہے اور اس طرح آریہ سماج اور برہمو سماج جیسے مذہبی فرقے جو اپنی الگ شناخت پر اصرار کرتے ہیں، مایوسی کا شکار ہوئے ہیں کیونکہ وہ اپنی اقلیتی حیثیت منوانا چاہتے ہیں۔

آخر میں اس بات کی یاددہانی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سینٹ اسٹیونز کالج کے معاملے میں اپنے ایک فیصلے میں سپریم کورٹ نے 1992 میں پچاس فی صد اقلیتی طلبہ کے داخلے کی حد مقرر کی تھی۔ اس فیصلے اور عدالت کے موجودہ فیصلے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عدالت نے اقلیتوں کے اس حق کو پوری طرح تسلیم کیا ہے کہ وہ اپنے تعلیمی ادارے قائم کریں اور چلائیں لیکن تعلیم کے معیار اور انتظام و انصرام میں شفافیت بھی قائم رکھیں۔ بظاہر یہ ایسا متوازن فیصلہ ہے جس سے اقلیتوں کے حقوق بھی محفوظ رہیں اور اکثریتی فرقے کے اندیشوں کا بھی ازالہ ہوتا ہے۔ جہاں تک ریاستی سرکاروں کے ذریعے مداخلت کا معاملہ ہے تو اس میں ہمیشہ ہی عدالتوں سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔ بہرحال، اس فیصلے کے حوالے سے بہت سے دانش وران اور اداروں نے اپنی اپنی آرا کا اظہار کیا ہے۔ مختلف نقطہ ہائے نظر کو "اردو دنیا" کے قارئین کے سامنے لانے کے لیے چند مضامین خصوصی گوشے کے تحت شامل کیے جارہے ہیں۔

□□□

وملیش کانتی ورما

گیسٹ کالم

ہندستانی زبانیں اور ہندی ــــ داخلی رشتوں کی وضاحت

ہندستان کی پیچیدہ لسانی اور سماجی تشکیل کی وجہ سے علماء نے ہندستان کو کبھی تو سماجی و لسانی جوائنٹ[1] تو کبھی لسانی و سماجی اکائیوں میں موجود ہم آہنگی کی وجہ سے اسے ایک لسانی علاقے[2] سے تشبیہ دی ہے۔ ہندستان کی مردم شماری[3] کے مطابق ہندستان میں چار خاندانِ السنہ (ہند یورپی، دراوڑ، منڈا یا آسٹرک اور تبتی چینی خاندان) کی 1652 زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں سے 1455 زبانیں ایسی ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد دس ہزار سے کم ہے۔ باقی 197 زبانوں میں سے ملک کی چودہ زبانوں کو ہندستان کے آئین سازوں نے ملک کی اہم زبانیں مان کر آٹھویں شیڈول میں رکھا تھا۔ یہ زبانیں تھیں: (1) آسامی (2) اڑیا (3) اردو (4) کنڑ (5) کشمیری (6) گجراتی (7) تمل (8) تیلگو (9) پنجابی (10) بنگلہ (11) مراٹھی (12) ملیالم (13) سنسکرت (14) ہندی۔ ان چودہ زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد ملک کی کل آبادی کا 98 فیصد تھی۔ بعد میں آٹھویں شیڈول میں سندھی جڑی اور پھر نیپالی، کوکنی اور منی پوری بھی جوڑ دی گئیں۔ اب آٹھویں شیڈول میں ملک کی 18 زبانیں شامل ہیں اور 1991 کی مردم شماری[4] کے مطابق ان زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد ملک کی آبادی کا 99.92 فیصد ہے۔ نتیجتاً آج ملک کی 18 اہم زبانیں ہیں۔ یہ زبانیں دنیا کے تین خاندانِ السنہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہند یورپی خاندان کے تحت آسامی، اڑیا، اردو، کشمیری، گجراتی، پنجابی، بنگلہ، مراٹھی، سندھی، کوکنی، نیپالی، سنسکرت اور ہندی زبانیں آتی ہیں۔ دراوڑ خاندان کی زبانیں تمل، تیلگو، ملیالم اور کنڑ ہیں اور تبتی، چینی خاندان سے منی پوری کا تعلق ہے۔

ان اہم زبانوں میں ہندی کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ اسے قومی زبان، سرکاری زبان اور رابطے کی زبان کی حیثیت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندی علاقے کے اعتبار سے ملک کے سب سے بڑے خطے کی زبان ہے۔ یہ ملک کے گیارہ صوبوں اترپردیش، مدھیہ پردیش، راجستھان، بہار، ہماچل پردیش، ہریانہ، چھتیس گڑھ، اترانچل، جھارکھنڈ، دلی اور انڈمان نکوبار جزیرے کی اہم زبان ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد ملک کی آبادی کا 42.88 فیصد ہے اور تجارت، عوامی ذرائع ترسیل اور سیاست کے نقطۂ نظر سے یہ ملک کی رابطے کی زبان ہے۔ اس لیے ہندستان کی زبانوں میں ہندی نمائندہ زبان بھی مانی گئی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جہاں دوسری ہندستانی زبانیں اپنے اپنے علاقے کی وجہ سے جانی جاتی ہیں جیسے پنجابی پنجاب کی زبان، مراٹھی مہاراشٹر کی، بنگلہ بنگال کی، آسامی آسام کی، تمل تمل ناڈو کی، وہیں ہندی، ہندی یا ہندستانی، ہندستان کی زبان کہی جاتی ہے۔ ہندی کی اسی وسعت کو دیکھتے ہوئے مہاتما گاندھی نے ہندی کو قومی زبان کا نام دیا تھا اور ملک کے سبھی سیاست دانوں نے جو خصوصاً ہندی علاقے سے تھے، ہندی کی حمایت کی تھی اور اس کے فروغ و ترقی کے لیے بڑے پیمانے پر منصوبے بنائے تھے۔ یہ زبان ہندستان کی جنگِ آزادی میں انقلاب کی زبان بھی بنی تھی۔

ہندی ترقی یافتہ لسانی، ادبی اور تہذیبی قدروں کی ترجمان ہے۔ یہ سنسکرت جیسی قدیم ترقی یافتہ زبان کی وارث ایک ہمہ گیر زبان ہے۔ اس نے صوتیات اور ذخیرۂ الفاظ دونوں ہی اعتبار سے مختلف ہندستانی اور غیر ملکی زبانوں سے بے شمار الفاظ قبول کیے اور اپنے لسانی ڈھانچے میں ڈھال کر ہندی کو فروغ دیا ہے۔ مختلف علاقوں کے صوفیوں اور مختلف نظریوں اور مذاہب کے پیروکاروں نے ہندی کو ذریعہ اظہار بنایا اور اسے ملک کے کونے کونے تک پہنچایا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی ہی پورے ہندستان کی ایک ایسی زبان ہے جو کشمیر سے کنیا کماری تک اور کامکھیا سے کچھ تک سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ حقیقتاً ایک ہزار برسوں سے ہندی ملک کی مشترکہ تہذیب کی ترجمان رہی ہے۔ یہ ملک کے مختلف زبانوں کے بولنے والے صوبوں کی اہم رابطے کی زبان اور مذہبی، تہذیبی و تجارتی مرکزوں میں لین دین کا ذریعہ رہی ہے۔

مہامہوپادھیائے ہری پرساد شاستری کے مرتب کردہ 'بودھ گان اور دوہا' کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ساتویں صدی میں بنگال کے سِدھ اپنے افکار کی تبلیغ کے لیے ہندی کا استعمال کرتے تھے۔ ناتھ پنتھ کے صوفی گورکھ ناتھ نے اپنے نظریے کی تبلیغ کے لیے سنسکرت کے ساتھ ہندی کا سہارا لیا۔ ہندی ادب کے عہدِ ماضی میں گہنی ناتھ، مکتابائی اور نام دیو وغیرہ مہاراشٹری سنتوں نے ہندی میں تخلیقات پیش کیں۔ صوفی سنتوں نے بھی اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ہندی کو اپنایا۔ صوفی سنت عربی و فارسی کے عالم ہوتے تھے لیکن وہ روزمرہ یا مذہبی مجلسوں میں ہندی میں ہی تبلیغ کرتے تھے۔ صوفی شاعروں کی بیشتر تخلیقات فارسی رسم خط میں ہوتے ہوئے بھی اودھی زبان میں ہیں۔ امیر خسرو فارسی کے عالم تھے، لیکن ہندی میں تخلیق کر کے جہاں انھوں نے اس ملک کی زبان کے لیے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے وہیں اسے وسیع

تعلیم یافتہ سماج تک بھی پہنچایا ہے۔ عہدِ وسطیٰ میں آگرہ ملک کی سیاست کا، اور برج کی سرزمین تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی۔ یہاں کی زبان برج، برج علاقے کی ادبی زبان تھی۔ اس کے وسیع اثر کا اندازہ مسلمان صوفی شاعر رس خان کے مصرعے 'مانُس ہوں تو وہی رس خان بسوں برج گوکل گاؤں کے گوارن' سے لگایا جاسکتا ہے۔ قابلِ ذکر ہے کہ غیر ہندی علاقوں کے بے شمار ادیبوں نے ہندی میں تخلیقات پیش کیں۔ گجرات کے مالن، اربا، دیارام نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے ہندی کا سہارا لیا۔ بنگال کے حکمراں حسین شاہ کی سرپرستی میں شاعر قطبن نے 'مرگاوتی' کے نام سے عشقیہ شعری تخلیق پیش کی اور بہت سے مسلمان اور ہندو شاعروں نے ودیاپتی کے 'لیلا پرک' گیتوں سے متاثر ہو کر 'برج بُلی' میں رادھا کرشن کی لیلاؤں کا ذکر کیا۔ آسام کے شنکر دیو اور نارائن دیو نے ہندی میں صوفیانہ دوہوں اور پنجاب کے گرونانک، گروگوبند سنگھ وغیرہ سکھ گروؤں نے ہندی میں مُکتک (شدتِ جذبات سے بھرپور شاعری) اور پربندھ کاویہ (طویل بیانیہ شاعری) کے ذریعے اپنے صوفیانہ خیالات پیش کیے۔ دکن میں دکنی ہندی کا آغاز اور استعمال دراوڑ زبانوں اور ہندی کے داخلی رشتوں کی بخوبی وضاحت کرتا ہے۔

یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ ہندستان کی یک جہتی کا مرکز گنگا و جمنا کا علاقہ رہا ہے۔ رام، کرشن اور بدھ جیسی عظیم مذہبی شخصیتوں کی جائے پیدائش اور عملی کارناموں کی سرزمین اور اسی طرح کاشی، متھرا، ہری دوار اور گنگا جمنا سرسوتی کا سنگم پریاگ پورے ملک کے لیے صدیوں سے مرکزِ توجہ رہا ہے۔ ملک کی تہذیبی یک جہتی میں ہندی علاقے اور ہندی کا اہم رول ہے۔

ہندستان کی بیشتر زبانیں چاہے وہ کسی بھی خاندانِ السنہ سے تعلق رکھتی ہوں، ان میں غیر معمولی مماثلت ہے۔ ہندستان کی 18 اہم زبانوں میں جو آئینِ ہند کے آٹھویں شیڈول میں شامل ہیں تین کا تعلق تین خاندانِ السنہ سے ہے: ہندیورپی خاندان، دراوڑ خاندان اور تبت چینی خاندان؛ چوتھی زبان منڈاری خاندان کی ہے جس کی اہم ہندستانی زبان سنتھالی ہے۔ ہندستانی زبانوں کا مطالعہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ ہندیورپی خاندان کی ہندستانی زبانیں اپنے خاندان کی دیگر ہندیورپی زبانوں سے بالکل مختلف ہیں جبکہ وہ ہندستان کے دوسرے خاندان کی زبانوں سے مماثلت رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہندی، ہندیورپی خاندان کی جدید ہند آریائی زبان ہے۔ اس میں اور دراوڑ خاندان کی زبان تمل میں کئی مماثلتیں ہیں جبکہ ہندیورپی خاندان کی یورپی زبانوں انگریزی، جرمن، فرنچ میں یہ مماثلتیں نہیں ہیں۔ اسی طرح ہندی دوسرے خاندان کی زبان تمل سے زیادہ قریب ہے جبکہ اپنے ہی خاندان کی انگریزی، جرمن وغیرہ سے دور۔ اسی طرح ہندی اور تمل کی مماثلت منڈاری خاندان کی زبانوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اپنے خاندان کی زبانوں کے علاوہ مختلف خاندانِ السنہ کی ہندستانی زبانوں کی یہ مماثلت 'کثرت میں وحدت' کے اصول کی تصدیق کرتی ہے۔

اگر ہم ہندستانی زبانوں اور ہندی کے داخلی رشتوں کو دیکھیں تو ہمیں غیر معمولی مماثلتیں نظر آتی ہیں جو محض اتفاق نہ ہو کر ان زبانوں کے تہذیبی و سماجی رشتوں پر روشنی ڈالتی ہیں اور خارجی اختلافات اور داخلی وحدت کی تصدیق کرتی ہیں۔ یہ مماثلت صوت، لفظ، جملے اور رسم خط ہر سطح پر دکھائی پڑتی ہے۔

ہندستانی زبانوں میں خواہ وہ کسی خاندانِ السنہ کی ہوں، ان کے صوتی نظام میں ایک مماثلت نظر آتی ہے۔ آریائی خاندان کی جدید ہند آریائی زبانوں اور دراوڑ خاندان کی زبانوں کی ابجدی ترتیب ایک ہی ہے۔ अ سے ह تک کے مصوتے اور क سے ह تک کے مصمتے۔ دراوڑ خاندان کی قدیم اور اہم زبان تمل میں بھی جس میں مصمتوں کی تعداد محدود ہے، حروفِ تہجی دیوناگری سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن ہندی اور تمل دونوں زبانوں کے حروفِ تہجی میں مصمتوں کی ترتیب ہندی ہی کی طرح ہے۔ تمل میں مصمتوں کی ترتیب क, ङ, च, ञ, ट, ण, त, न, प, म, य, र, ल, व, ष, ळ, ऱ, ऩ ہے۔ آخری چار مصمتوں کے علاوہ جو تمل کی خصوصی آوازیں ہیں، باقی تمام مصمتوں کی ترتیب دیوناگری حروفِ تہجی کے مطابق ہے۔

ہندی حروفِ تہجی کے مصوتوں میں قلیل (ह्रस्व) اور طویل (दीर्घ) کی ترتیب کا اہتمام ہے، مثال کے طور پر الف अ اور آ आ، ای इ اور ای ई، او उ اور او ऊ یہ ترتیب سبھی ہندستانی زبانوں میں دکھائی دیتی ہے۔ ہندیورپی خاندان کی یورپی زبانوں کے مصوتوں میں یہ ترتیب دکھائی نہیں دیتی ہے۔

ہندستانی زبانوں میں مصمتوں کی ترتیب زیادہ سائنٹفک ہے۔ گلے سے ہونٹ تک سے ادا ہونے والے مصمتوں میں بھی یہ ترتیب دکھائی دیتی ہے۔ [(ک ورگ) क वर्ग (چ ورگ) च वर्ग (ٹ ورگ) ट वर्ग (ت ورگ) त वर्ग اور (پ ورگ) प वर्ग کی ترتیب میں] اس سائنٹفک مصمتی ترتیب کی وجہ سے ہندستانی زبانوں میں بہت کم فرق پیدا ہوا اور مماثلت بنی رہی۔

ٹ ट کا تلفظ ہندستانی زبانوں کی خصوصیت ہے۔ دیگر کسی ہندیورپی خاندان کی، یورپی زبان میں (ٹ ورگ) ट वर्ग کی آوازوں کا تلفظ نہیں ملتا۔ ٹ ट ورگ کی آوازیں ہندیورپی، دراوڑ اور منڈاری خاندان کی زبانوں میں بھی ہیں۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ ٹ ट ورگ کی آوازیں سنسکرت اور جدید ہند آریائی زبانوں میں دراوڑ زبانوں کے اثر سے آئیں۔ ہندستان کی

زبانوں میں ت त اور ٹ ट۔ اسی طرح (د) द اور (ڈ) ड آوازیں صوت کی بنیادی اکائی ہیں۔ جبکہ یورپ کی زبانوں میں ٹ t اور ڈ d کا تلفظ ہے اسی طرح (ش) ष اور (ن) ण بھی ہندستانی زبانوں کی خصوصیات ہیں۔

ہکاری آوازیں ہندستانی زبانوں کی خصوصیت ہیں۔ حقیقتاً پہلے کی سبھی ہند یورپی زبانوں میں ہکاری مصمتوں کا تلفظ تھا، جسے ان زبانوں نے بعد میں چھوڑ دیا۔ سنسکرت میں یہ تلفظ محفوظ رہا جس سے وہ دیگر ہندستانی زبانوں میں آیا۔ دراوڑ خاندان کی زبانوں نے ہند آریائی خاندان کی زبانوں کی اس خصوصیت کو اپنا لیا۔

ہر ورگ کی انفی آوازیں، ان کا تلفظ اور صوتیات ہندستانی زبانوں کی خصوصیت ہے جبکہ یورپ کی زبانوں میں دو ہی انفی مصمتے (ن) न اور (م) म رہ گئے ہیں۔ ہندستانی زبانوں میں انگہ ङ، م ञ، ن ण، ن न، م म، پانچ انفی مصمتے ملتے ہیں۔

الفاظ کی سطح پر ہندی اور ہندستانی زبانوں میں مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ ہندی کی لفظیات خاص طور سے ہند آریائی زبان کی لفظیات پر مشتمل ہے۔ ہندی میں بہت سارے الفاظ لگاتار سنسکرت سے آئے۔ اگنی، نبھ، وایو، جل، دھرتی، ماتا، پتا، دھرم، کرم، جنم، مرتیو وغیرہ۔ کچھ الفاظ سنسکرت سے پالی، پراکرت اور اپ بھرنش سے ہوتے ہوئے ہندی میں آئے اور دوسری ہندستانی زبانوں تک بھی پہنچے۔ سنسکرت کے وہ الفاظ جو ہندی میں صوتی تبدیلی کے ساتھ آئے وہ تدبھو الفاظ کہلائے جیسے اگنی سے آگ، پوروا سے پورب، دنت سے دانت، میور سے مور، چتردش سے چودہ، کرشن سے کانہا، راتری سے رات۔ علاقائی الفاظ میں ان کا شمار ہندی میں ہوتا ہے جو کس ذریعے سے آئے، اس کی آج ہمیں کوئی جانکاری نہیں ہے۔ ایسے الفاظ ملک میں پیدا ہوئے دیشج (देशज) الفاظ مانے گئے۔ پیڑ، کتا، بلی، چوہا، جھگڑا، جھوٹ، لڑکا وغیرہ ایسے ہی الفاظ ہیں۔

ہندی چونکہ ایک وسیع علاقے کی زبان ہے اور ہندی بولنے والے لگ بھگ سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں، اس لیے عین ممکن ہے کہ اس نے مختلف ہندستانی زبانوں سے بھی الفاظ مستعار لیے ہوں۔ ان الفاظ میں کہیں تو صوتی تبدیلی آئی تو کہیں انھیں اسی شکل میں قبول کر لیا گیا۔ ہندی کی سرحدی ہندستانی زبانیں پنجابی، سندھی، گجراتی، مراٹھی، تیلگو، اڑیا، بنگلہ، نیپالی وغیرہ ہیں۔ ہندی نے اگرو، چندن، کٹھن، مین وغیرہ الفاظ دراوڑ زبانوں سے؛ تانبول، شرنگار، آکل، منڈاری زبانوں سے؛ اپنیاس، کلپ، دھنیہ واد بنگلہ سے، واتکیہ، لاگو، چالو، پرگتی مراٹھی سے، ہڑتال گجراتی سے اور پھولے بھٹورے پنجابی سے لیے۔

عربی و فارسی سے ہندی میں آئے الفاظ بھی ہندی میں ایسے رچ بس گئے ہیں کہ وہ اب ہندی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ یہ الفاظ ہندی میں اس وقت شامل ہوئے جب مسلم حکمرانوں نے خصوصاً ترکی بولنے والے مغل حکمرانوں نے مذہبی امور کے لیے عربی اور حکومت کے لیے فارسی زبان کا استعمال شروع ہوا۔ عربی کے الفاظ میں انتظام، اثر، شروع، وکیل، کتاب، حکم، عقل، مشہور، معلوم اور فارسی کے الفاظ میں چشمہ، راستہ، آدمی، عورت، قالین وغیرہ بے شمار الفاظ ہیں جن کا استعمال ہندی میں بڑی آسانی کے ساتھ ہوتا ہے۔ ترکی زبان کے الفاظ جو ہندی میں رائج ہیں وہ چاقو، قینچی، توپ، داروغہ، چیچک، بیوی، باورچی، قابو، تمغہ، چغہ، قرقی وغیرہ ہیں۔ غور طلب بات تو یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر الفاظ کے ہندی یا ہندستانی زبانوں میں مترادف بھی نہیں ہیں۔

مغلوں کے بعد ہندستان میں پرتگال، فرانس، ہالینڈ اور انگلینڈ وغیرہ یورپی ملکوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کیں۔ ڈچ ہندستان سے جلد ہی چلے گئے۔ پرتگالیوں اور فرانسیسیوں نے مغرب اور جنوب کے آخری کنارے پر اپنی نوآبادی قائم کی لیکن انگریز سارے ہندستان پر چھاگئے۔ ملک انگریزوں کا غلام ہوگیا۔ انگریزی، حکومت، تعلیم اور تہذیب کی زبان بنی۔ انگریزی کا اختیار اتنا بڑھا کہ تمام ہندستانی زبانوں کی اہمیت اس کے سامنے بہت کم ہوگئی۔ انگریزی کی اجارہ داری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ ملک کی آزادی کے 55 برس بعد بھی یہ ملک کی سرکاری زبان بنی ہوئی ہے اور ہمارے پورے ملک میں تعلیم اور برتری کی زبان ہے۔ انگریزی کے بغیر ملک اپنے آپ کو بے سہارا اور اپاہج سمجھنے لگا۔ یہ فطری امر تھا کہ ہندی میں پرتگالی، فرینچ اور انگریزی کے الفاظ آتے۔ انگریزی کے الفاظ تو ہندی میں اس قدر آگئے کہ ان کی طویل فہرست بن سکتی ہے۔ یہ غیر ملکی الفاظ ہندی لفظیات کا لازمی حصہ بن گئے۔ ان الفاظ کو ہندی کے مزاج کے مطابق، ہندی کی شکل وصورت میں ڈھال لیا گیا۔

قابل ذکر ہے کہ ہندی میں جس ذریعے سے یہ الفاظ آئے ہیں، انھیں ذریعوں سے یہ الفاظ ہندستانی زبانوں میں پہنچے ہیں۔ ان غیر ملکی لفظوں میں صوتی تبدیلیاں بھی صفر کے برابر ہوئی ہیں۔ کیونکہ انگریزی ملک کے تمام صوبوں میں تعلیم، حکومت اور قانون کی زبان تھی اس لیے ان غیر ملکی لفظوں کی شکل و صورت بھی تمام ہندستانی زبانوں میں محفوظ رہی۔ اس طرح کسی دو ہندستانی زبانوں میں مختلف ذرائع سے آئے ہزاروں الفاظ ایک جیسے ہیں اور یہ الفاظ دو زبانوں کے درمیان آپسی فہم و ادراک کی وجہ بنتے ہیں۔ حقیقتاً ہمارے سامنے ایک ہندستان گیر لفظیات ہے جو تمام ہندستانی زبانوں میں کم و بیش عام طور سے مستعمل ہے۔ یہ درآمد شدہ غیر ملکی ذخیرۂ الفاظ ہندستانی زبانوں اور ہندی کے داخلی رشتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔

ہندستانی زبانوں میں درآمد شدہ لفظیات کی ایک خصوصیت اور بھی ہے کہ ہندستانی زبانوں نے تتسم، تدبھو وغیرہ سنسکرت الفاظ اور فارسی و عربی جیسی زبانوں سے آئے الفاظ کے ساتھ ان کے مزاج کو بھی قبول کیا ہے اور انھیں اپنے مزاج کے مطابق بھی ڈھالا ہے۔ غیر ملکی لاحقے اور سابقے کے ساتھ ہم ہندستانی زبانوں میں الفاظ بھی بناتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندی میں بے سرا، ناسمجھ، چوڑی وار، گجراتی، بے مان (بے ہوش)، دھاردار (پینا)۔ اس طرز پر الفاظ بنانے کے اصولوں کی وجہ سے ہندستانی زبانوں کے خاندانی فہم وادراک میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

ہندستانی زبانوں میں روز بروز فرہنگِ اصطلاحات میں اضافہ بھی انھیں اور قریب لارہا ہے۔ تمام ہندستانی زبانیں سائنس، تعلیم، قانون، حکومت اور نظم و نسق کے شعبے میں زبان کی ترقی کے لیے فرہنگِ اصطلاحات کی ضرورت محسوس کرتی ہیں۔ ہم فرہنگ تیار کرنے کے لیے عام طور سے سنسکرت کی مدد لیتے ہیں کیونکہ سنسکرت کے پاس ترقی یافتہ اور کثیر لفظیات تو ہے ہی، ساتھ ہی ساتھ سنسکرت کے ذریعے بنائے گئے الفاظ ہندستانی زبانوں میں بے شمار ہیں۔ مثال کے طور پر دور بھاش، دوردرشن، دورلیکھ، دورمدرک، ذرلیکھ وغیرہ۔ راشٹرپتی، پری پریکھ، سنکرانتی، سچارویوستھا، مانوسنسادھن۔ انگریزی سے لیے گئے اصطلاحی الفاظ کی بھی ہندی میں کمی نہیں ہے۔ اکادمی، یونین، اسٹرائک، راکٹ، میزائل، کیپسول، لیزر، ایکسرے وغیرہ۔

بین الاقوامی سطح پر مماثل فرہنگِ اصطلاحات کا استعمال اور ترسیل و ابلاغ کا فروغ زبانوں کو نزدیک لاتا ہے۔ زبان جاننے والوں کے علم کے فروغ کے ساتھ فرہنگِ اصطلاحات کے استعمال میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ اصطلاحی الفاظ اپنے استعمال کے فروغ سے ہندستانی زبانوں کو ترقی یافتہ تو بنا ہی رہے ہیں، انھیں نزدیک لانے میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندستان گیر پیمانے پر ایک معیاری فرہنگِ اصطلاحات تیار کی جائے۔

جملے کی ساخت، زبان کے تجزیے کا مشکل پہلو ہے۔ مختلف ہندستانی زبانوں کی بنیادی وحدت یا داخلی رشتوں کی وضاحت کے لیے میں یہاں کچھ مثالیں ہندستانی زبانوں کے جملے کی ساخت کی مماثلت کے اعتبار سے دینا چاہوں گا۔ مختلف زبانوں میں مختلف صرفیہ ترتیب ہوتی ہے۔ انگریزی اور ہندی دونوں ہی ہند یورپی خاندان کی زبانیں ہیں۔ انگریزی زبان کے جملے میں صرفیہ ترتیب فاعل+ فعل+ مفعول ہے لیکن ہندی زبان میں یہ ترتیب فاعل+ مفعول+ فعل ہے۔ انگریزی زبان کا ہی صرف و نحو جرمن، فرانسیسی، اسپینی وغیرہ زبانوں میں بھی ملتا ہے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ہندی کی صرفیہ ترتیب اپنے خاندان کی ہندیورپی زبانوں سے مختلف لیکن ہندستانی زبانوں کے مطابق ہے۔ ہندی میں جملے کی ساخت کا صرف و نحو آریائی ہندستانی شاخ کی زبانوں، دراوڑ زبانوں اور منڈاری خاندان کی زبانوں میں بھی ملتا ہے۔

صرف و نحو کے ساتھ ہی اس سے جڑی ایک دوسری خصوصیت جملے میں الفاظ کی ترتیب بھی ہے۔ ہندی میں ہم اسم کے بعد جزوی (کارک) نشانوں کا استعمال کرتے ہیں، اس لیے ان جزوی (کارک) نشانوں کو لاحقے بھی کہا جاتا ہے۔ لاحقے کا مطلب ہے بعد میں جوڑا جانے والا حصہ، جیسے جیب میں (In the pocket)، بازار کو (To the market)، گھر کے لیے (for the home)۔ فارسی زبان میں بھی سابقے کا استعمال ہوتا تھا جیسے دراصل (اصل میں)، تازندگی (زندگی بھر)، سوائے آپ (آپ کے سوا)۔ شاید سابقے آریائی زبانوں کی عام خصوصیت تھے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہند آریائی زبانوں میں ہی لاحقے کا فروغ ہوا۔ ہند آریائی زبانوں، دراوڑ زبانوں اور تبتی برمی طبقے کی ہندستانی زبانوں (منی پوری وغیرہ) میں لاحقے کا استعمال ہوتا ہے اور اس طرح تمام ہندستانی زبانیں لاحقی زبانیں کہی جاسکتی ہیں۔

فعل کی تشکیل میں بھی صرفیہ ترتیب کی طرف اگر غور کیا جائے اور انگریزی اور ہندستانی زبانوں کے اختلافی پہلوؤں کا موازنہ کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہندی زبان میں فعل پہلے آتا ہے اور امدادی فعل بعد میں اور انگریزی میں فعل بعد میں آتا ہے اور امدادی فعل پہلے۔ موازنہ کیجیے۔

(الف) یہ کہا جاچکا ہے /this has been said/

(ب) کام کیا جارہا ہے /the work is being done/

تمام ہند آریائی زبانوں اور دراوڑ زبانوں میں فعل کی تشکیل کی ہیئت ایک جیسی ہے۔ ان میں فعل پہلے آتا ہے اور امدادی فعل بعد میں۔ فعلِ مرکب (رنجک کریا) کے اعتبار سے بھی تمام ہندستانی زبانوں میں مماثلت ہے۔ 'کرنا' فعل ہے، اسی فعل سے کرلینا، کردینا، کرڈالنا، کرگزرنا، کررکھنا وغیرہ افعالِ مرکب (رنجک کریائیں) بنے ہیں۔ ہندیورپی خاندان کی یورپی زبانوں میں فعلِ مرکب (رنجک کریا) کا اصول نہیں ہے۔ سنسکرت میں بھی فعل مرکب (رنجک کریائیں) نہیں ہے۔ یہ خصوصیت صرف جدید ہندستانی زبانوں میں دکھائی دیتی ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ فعل مرکب دراوڑ زبانوں کی خصوصیت تھی اور وہیں سے دیگر ہندستانی زبانوں میں منتقل ہوئی۔ انگریزی میں علاحدہ فعل الگ ہوتے ہیں۔ فعل میں تبدیلی کر کے نہیں بنتے، کچھ مثالیں پیش ہیں۔

بننا to get built

لکھنا to write

بنانا to construct

لکھانا to dictate

بنوانا to get it constructed by some one

لکھوانا to make someone write

پڑھنا to study

کھانا to eat

پڑھانا to teach

کھلانا to feed

پڑھوانا to get taught

کھلوانا to get someone fed

بول چال کے اظہار کو ملک اور زمانے کی حدود سے باہر نکالنے کے لیے انسان نے رسم خط ایجاد کیا۔ ہندستانی زبانوں میں کشمیری، سندھی اور اردو کو چھوڑ کر جو فارسی رسم خط کے مطابق ہیں، کل نو رسم خط ہیں۔ یہ سب براہمی رسم خط سے ماخوذ ہیں۔ اس لیے ان میں ابجدی مماثلت اور لکھنے کا طریقہ ایک جیسا ہے۔ ہندی، مراٹھی اور سنسکرت کا رسم خط دیوناگری ہے۔ تمل، تیلگو، ملیالم، کنڑ، گجراتی، پنجابی (گرومکھی)، بنگلہ (جو آسامی اور منی پوری کے لیے استعمال ہوتی ہے) زبانوں کے الگ الگ رسم خط ہیں۔ ارتقائی مراحل میں ان کے حروف میں تبدیلی تو آئی پھر بھی واضح طور پر مماثلت جھلکتی ہے۔

ہندستان کی سبھی اہم زبانوں میں لسانی سطح پر مماثلت کی وجہ سے ہندی اور ہندستانی زبانوں کے داخلی رشتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔ ہندستانی زبانوں کی اس بنیادی وحدت کی وجہ ملک کی تہذیبی ہم آہنگی وجود میں آئی ہے۔ مذہب، فلسفہ، ادب، آرٹ اور رسومات کی ہم آہنگی زبان کی وحدت کو مضبوطی عطا کرتی ہے۔ تمام زبانوں کے قواعد اور صرف و نحو کی اپنی اپنی خصوصیت ہے، ان کا اپنا رسم خط ہے، ان کی اپنی قابلِ قدر روایتیں ہیں، لیکن ان میں آپسی مماثلتیں بھی ہیں جو زبان کے فہم و ادراک میں اضافہ کرتی ہیں اور تمام زبانوں کو ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم ہندستان کو ایک کثیر لسانی علاقے کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب سنسکرت سارے ملک کو زبان اور ادب سے جوڑے ہوئے تھی اور مرکزی زبان تھی۔ اظہارِ خیال کے لیے سنسکرت کا استعمال کیا جاتا تھا۔ بعد میں یہ ذمے داری پالی اور پراکرت زبانوں نے ادا کی۔ آج تمام جدید ہندستانی زبانوں کا محور ہندی ہے جو ملک کی رابطے کی زبان ہے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اپنی کتاب 'ہند آریائی زبان اور ہندی' میں لکھتے ہیں:

"ہندی (ہندستانی) ایک وسیع رابطے کی زبان ہے۔ سنسکرت (جس سے یہ نکلی اور ناگری ہندی، جس سے یہ برابر اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کرتی رہتی ہے)، دراوڑ زبانیں (جن کے صرف و نحو، جملوں کی ساخت اور محاوروں کے کچھ بنیادی نکات اس میں ملتے ہیں) اور عربی و فارسی (جن کا اس کے لفظیات پر اثر پڑا ہے اور جس سے اُردو کا رسم خط، علمی اور تہذیبی الفاظ، ادبی ہیئتیں اور نمونے اور اسالیبِ بیان سب انھی سے آئے ہیں)، سب یکجا ہو کر ہندستانی میں ایک جگہ مل جاتے ہیں۔ تمام بڑی زبانوں کی طرح جن کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو چکی ہے (مثلاً انگریزی کی طرح) ہندستانی بھی اب صوبے یا ملک کے محدود دائرے سے باہر ہمہ گیر حیثیت حاصل کر رہی ہے۔ ہمیں اب اس زبان کے الفاظ کو دیکھتے ہوئے یہ حقیقت کھلے دل سے قبول کر لینی چاہیے کہ ہونہار اور ہاٹ بازار کی زبان، عام لوگوں کی آسان ہندستانی ہی ملک کی حقیقی قومی زبان ہے۔"[5]

آج نہرو میموریل لائبریری اور میوزیم کے زیر اہتمام ڈائرکٹر صاحب نے "ہندستانی زبانیں اور ہندی۔ داخلی رشتوں کی وضاحت" کے عنوان سے جس قومی سیمینار کا انعقاد کیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اس کا مقصد شاید ہندستانی زبانوں اور ہندی کے داخلی رشتوں کو ثابت کرنا یا اس کی وضاحت کرنا ہی محض نہیں ہے بلکہ علماء کے ساتھ اور ان کی مدد سے اس موضوع پر سنجیدہ بحث کرنا بھی ہے کہ ہندستانی زبانوں اور ہندی کے داخلی رشتوں کو کیسے مستحکم اور مضبوط بنایا جا سکتا ہے۔ ہندی پکھواڑے میں اس سیمینار کے انعقاد کی کامیابی بھی شاید یہی ہے۔

ہندستان کے آئین کی دفعہ 351 میں ہندی کی ترقی و فروغ کے لیے خصوصی ذکر ہے۔ واضح طور پر اس کا ذکر ہندستانی زبانوں اور ہندی کے داخلی رشتوں کی طرف اشارہ تو کرتا ہی ہے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ ہندی کی ترقی اور ہندستانی زبانوں کا فروغ ایک دوسرے پر منحصر ہے۔

ہندستانی زبانوں اور ہندی کے داخلی رشتوں کا ادبی و لسانی سطح پر مختصر تجزیہ اس مضمون میں کیا جا چکا ہے۔ اب ضرورت اس بات پر غور کرنے کی ہے کہ داخلی رشتے کیسے مضبوط اور مستحکم ہوں۔ قابلِ ذکر ہے کہ آئین کے آٹھویں شیڈول میں جو اٹھارہ زبانیں ہیں، ان میں دیگر ہندستانی زبانوں کے ساتھ ہندی بھی شامل ہے۔ جس کا سرکاری زبان کی حیثیت سے دفعہ (1) 343 میں پہلے ہی ذکر ہو چکا ہے۔ اسی طرح سنسکرت بھی اس میں شامل ہے جو جدید زبان نہیں ہے اور نہ ہی بول چال میں آج اس کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ شاید اس لیے ہے کہ ہندی اور سنسکرت دونوں زبانیں تمام ہندستانی زبانوں کی مددگار ہیں اور ان دونوں کی مدد ہندستانی زبانوں کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ سنسکرت جہاں تمام ہندستانی زبانوں کے ساتھ ہندی کے لیے بھی آبِ حیات کا کام کرتی ہے وہیں ہندی تمام جدید ہندستانی زبانوں کو قومی اظہار عطا کرنے کے قابل بناتی ہے۔

ہندستان کے آئین کی دفعہ 351 میں ہندی کی ترقی و فروغ کا ذکر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہندی اسی وقت مضبوط ہوگی اور ہندستان کی صحیح اور پوری طرح نمائندگی کر سکے گی جب وہ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کی ترجمانی کا ذریعہ بنے اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب وہ ہندستانی زبانوں کی صرف و نحو، ہیئت اور لفظوں کو اپناتے ہوئے اپنے ذخیرۂ الفاظ کو خصوصاً سنسکرت سے اور عموماً دیگر ہندستانی زبانوں سے مالا مال کرے۔ 'رام چرت مانس' میں کھیا کی خصوصیت تلسی نے یوں بیان کی ہے۔

کھیا کھو سو چاہیے کھان پان سو ں ایک
پالے پوسے سکل انگ تلسی سہیت و ویک (6)

سارے جسم کی پرورش و پرداخت منہ سے ہوتی ہے۔ منہ سے انسان کھانا کھاتا ہے اور اس سے حاصل طاقت جسم کے ہر حصے کو ملتی ہے۔ اسی طرح کھیا کے منہ کی طرح ملک کی نمائندہ زبان ہندی ہے اور تمام ہندستانی زبانیں اس کا حصہ ہیں۔ ہندستانی زبانوں کی ترقی اور ان کی طاقت ہندی پر منحصر ہے۔ ہندی ہی ان ہندستانی زبانوں کو اظہار کی طاقت اور فروغ دے گی۔ ہندی مستحکم ہوگی تو ہندستانی زبانیں بھی مضبوط ہوں گی۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہندستانی زبانوں کی طاقت ہندی کی طاقت ہے۔ جب جسم کا ہر حصہ مضبوط ہوگا تبھی جسم صحت مند اور مضبوط بنے گا۔ حقیقتاً ہندی اور ہندستانی زبانیں ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔

ہندی ملک کی اہم زبان ہے۔ علاقے، زبان بولنے والوں کی تعداد اور رابطے کی زبان کی حیثیت سے ہندی ملک کی اہم زبان ہے لیکن یہ ملک کی نمائندہ زبان کی حیثیت سے اسی وقت مستحکم ہوگی، جب یہ صرف ہندی علاقے اور ہندی بولنے والوں کی زبان سے اوپر اٹھ کر تمام ہندستانی زبانوں کی نمائندہ زبان بنے گی اور جب اس کا عکس پورے ملک پر یکساں پڑے گا اور یہ پورے ملک، مختلف صوبوں، ان کے ادب و اقدار اور ان کی زندگی کی ترجمانی کا ذریعہ بن جائے گی۔ یہ اسی وقت ممکن ہو سکے گا جب ہندستانی زبانوں کے ادب کے بیشتر حصوں کا ترجمہ ہندی میں ہوگا، صوبائی زبانوں کی فلمیں ہندی میں منتقل ہوں گی۔ ان کا علم و ادب اور ان صوبوں کی مکمل جانکاری ہندی میں موجود ہوگی تب جاکر ہندی ہندستانی صوبوں، ان کے روپ رنگ اور خصوصیت کو سمجھنے کا ذریعہ بن سکے گی۔ ابھی ایک صوبائی زبان کا ادیب، وسیع تعلیم یافتہ طبقے تک پہنچنے کے لیے ہندی میں لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ آرٹسٹ بڑے پیمانے پر ناظرین تک پہنچنے کے لئے ہندی فلموں میں کام کرتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ صوبائی زبانوں میں لکھے گئے ادب اور فلموں کا وسیع پیمانے پر منصوبہ بند طریقے سے ہندی زبان میں ترجمہ ہو؟ اس سے صوبائی زبانوں کا بھی فروغ ہوگا اور ان کے تراجم سے ہندی بھی مستحکم ہوگی۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کی ترقی اسی طرز پر ہوئی ہے۔ ہندی ہی کی طرح سبھی ہندستانی زبانوں کی قابلِ قدر ادبی روایت ہے۔ ان کے پاس ترقی یافتہ ذخیرۂ الفاظ ہیں اور وہ مخصوص علاقے کے جذبات، اعتقاد اور غور و فکر کے اظہار کی طاقت اور ذریعہ ہیں۔ ضرورت ہے ان کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں زیادہ ترقی یافتہ بنانے کی۔ مختلف ہندستانی زبانوں کے مابین آپسی رشتوں کو مضبوط بنانے کے لیے ہندی پل کا کام کرے گی جو وہ ایک ہزار برس سے کرتی آرہی ہے۔ ہندی کے ذریعے کسی بھی ہندستانی یا غیر ملکی زبان کو جاننے والا پورے ہندستان کو سمجھ سکے گا۔ ہاں یہ ذریعہ مضبوط ہونا چاہیے تاکہ وہ پورے ہندستان کی ترقی یافتہ زبانوں کی عظمت و اقدار کو بخوبی ڈھو سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہندی کو معیاری بنایا جائے۔ ہندی کی فرہنگِ اصطلاحات کو ترقی یافتہ بنایا جائے۔ ایک ہندستان گیر فرہنگِ اصطلاحات کو فروغ دیا جائے اور ہندی میں بھی ان تمام صلاحیتوں کا فروغ ہو جو ترقی یافتہ جدید زبان کے لیے آج ضروری ہیں۔

ہندستان ایک عظیم ملک ہے۔ یہ مختلف تہذیبوں کا ملک ہے اور ایک کثیر لسانی علاقہ ہے۔ ہندستان کی تمام زبانوں میں اپنی لسانی اور ادبی خصوصیات کے علاوہ یکسانیت بھی ہے۔ ان کی لسانی مماثلتیں، اقدار اور نظریۂ زندگی کی وجہ سے ان میں ربط و اشتراک ہے۔ ان داخلی رشتوں کے استحکام اور مضبوطی میں ہی ہندی کی طاقت اور ہندستانی زبانوں کی ترقی و فروغ مضمر ہے۔

حواشی

(1)- فرگیوسن، سی۔اے: نیشنل سوشل لنگوسٹک پروفائل فارمولاز، سوسیو لنگوسٹکس۔ مرتبہ برائٹ، 1966۔ ص313

(2)- دسمو۔ایم۔بی: انڈیا اے لنگوسٹکس ایریا لینگویج ان کلچر اینڈ سوسائٹی۔ مرتبہ ہائمس 1966، ص۔650

(3)- سینسس آف انڈیا 1967، جلد 1، حصہ (II)۔ سی (II)، نئی دہلی 1961

(4)- سینسس آف انڈیا 1991، سیریز 1۔ بھارت پارٹ IV۔بی (آئی) (اے)۔ سی سیریز لینگویج ٹیبل سی۔7، بھارت، راجیہ اور کیندر شاست پردیش

(5)- چٹرجی، سنیتی کمار: بھارتیہ آریہ بھاشا اور ہندی، راج کمل پرکاشن، دلی، اشاعت 1963، ص۔160

(6)- تلسی داس: رام چرت مانس

(مترجم: مشرف علی)

□□□

Snehkanchan, 73 Vaishali, Pitampura,
Delhi-110088

اوم کارناتھ کول / ابوالکلام

تعلیم میں اردو بولنے والوں کی لسانی ترجیحات

سماجی اور لسانی سروے

تعارف

تعلیم میں زبان کے بنیادی طور سے دو رول ہیں: (i) زبان بطور موضوعِ مطالعہ (ii) زبان بطور ذریعہ تعلیم۔ زبان بطور موضوعِ مطالعہ اور زبان بطور ذریعہ تعلیم کی پسند یا ترجیح کا تعلق براہِ راست زبان کی قوت، حیثیت اور افادیت سے ہوتا ہے جس کا تعین مختلف سماجی، معاشی، ثقافتی اور سیاسی عوامل کرتے ہیں۔ یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ لسانی ترجیحات کا مختلف زاویے سے مطالعہ کیا جائے۔ زبان کی تعلیم اور زبان بطور ذریعہ تعلیم کی ترجیحات اور اغراض و مقاصد کے پس پشت وجوہ کو طلبہ، والدین، صنعت و حرفت اور کاروبار کے مالکان، اساتذہ اور ماہرینِ تعلیم وغیرہ سے معلوم کیا جانا چاہیے۔ ہندستان میں حاوی کثیر لسانی صورتِ حال اور ملک کی تعلیمی پالیسی کے پیشِ نظر لسانی گروہ (Speech-Community) کی جو پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے، لسانی ترجیحات کا سروے کرنا صبر آزما کام ہے۔ یہاں پر دلّی کے ایک لسانی گروہ کا جس کی مادری زبان اردو ہے، نمونہ سروے (Sample Survey) کر کے نتائج پیش کیے جا رہے ہیں۔ یہ اسٹڈی یا مطالعہ دلّی اور اس کے گردونواح کے تقریباً 50 طلبہ، 30 والدین جن کی مادری زبان اردو ہے، اور مختلف زمروں کے 20 صنعت و حرفت اور کاروبار کے مالکان کے نمونہ سائز تک محدود ہے۔ نمونے کے انتخاب کے دوران خصوصی خیال رکھا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نمونے مختلف ہوں اور مختلف سماجی و معاشی زمروں کے جواب دہندگان (Respondents) کی نمائندگی کرتے ہوں۔

امورِ معلومہ (Data)

سوال نامہ اوّل

پہلا سوال نامہ طلبہ کے لیے تھا جس کے ذریعے ان کے نام، پتے، صوبے، درجے، زمرۂ عمر (Age-Group)، مادری زبان، دیگر معلوم زبانیں، مختلف سطحوں پر زیرِ مطالعہ زبانیں، مختلف سطحوں پر ذریعہ تعلیم، زبانی مہارت یا لیاقت، کون سی زبان سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں اور کون سی سب سے کم، پیشہ ورانہ اور تکنیکی معلومات حاصل کرنے کے لیے کون سی زبانیں استعمال کرتے ہیں اور آخر میں اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد کس طرح کا پیشہ یا ملازمت اختیار کرنا پسند کریں گے جیسی معلومات حاصل کی گئیں۔ ان کے نام، پتے، درجے اور زمرۂ عمر کا تطابق نہیں کیا گیا ہے۔ مختلف زمروں کے طلبہ اور مختلف الجنس جواب دہندگان کے انتخاب پر خصوصی دھیان دیا گیا ہے۔

اردو ہند آریائی زبان ہے جو بنیادی طور سے ہندستان کے سات صوبوں یعنی بہار، ہریانہ، ہماچل پردیش، مدھیہ پردیش، راجستھان، اتر پردیش اور دلّی میں بطور مادری زبان بولی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ زبان ہندستان کے مختلف خطوں میں بولی جاتی ہے۔ زیرِ نظر Data دلّی کے اردو مادری زبان والوں سے اکٹھا کیا گیا ہے۔ اردو مادری زبان بولنے والوں کے مطابق وہ درج ذیل دیگر زبانیں جانتے ہیں:

انگریزی	ہندی	پنجابی	فارسی
80فی صد	80فی صد	10فی صد	10فی صد

مختلف سطحوں پر زیرِ مطالعہ زبانیں

	پرائمری	مڈل	سکنڈری / ہائر سکنڈری	کالج
اردو	80فی صد	60فی صد	40فی صد	20فی صد
ہندی	40فی صد	40فی صد	60فی صد	20فی صد
انگریزی	60فی صد	100فی صد	100فی صد	80فی صد
فارسی	-	20فی صد	20فی صد	-

لسانی لیاقت

جواب دہندگان کے مطابق مختلف زبانوں میں ان کی لسانی لیاقت درج ذیل ہے:

	سمجھنا	بولنا	پڑھنا	لکھنا
اردو	100فی صد	100فی صد	100فی صد	100فی صد
انگریزی	100فی صد	100فی صد	100فی صد	100فی صد
ہندی	80فی صد	80فی صد	40فی صد	40فی صد
پنجابی	20فی صد	20فی صد	-	-
فارسی	10فی صد	-	10فی صد	10فی صد

درج بالا امور معلومہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جواب دہندگان ذو لسانی ہیں یعنی اردو اور انگریزی دونوں زبانیں جانتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر سہ لسانی ہیں یعنی اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانیں جانتے ہیں۔ ان میں سے کچھ پنجابی اور فارسی سے بھی شناسا ہیں گرچہ ان میں سے کسی نے بھی اسکول میں پنجابی زبان بطور مضمون نہیں پڑھی ہے تاہم لسانی رابطے کے ماحول میں انھوں نے بات چیت کرنے کا ہنر سیکھ لیا ہے۔ 80 فی صد جواب دہندگان ہندی سمجھنے اور بولنے کا دعویٰ کرتے ہیں جبکہ صرف 40 فی صد پڑھ اور لکھ سکتے ہیں۔ ہندی جاننے سے مراد روزمرہ کی لفظیات سے ان کی شناسائی ہے۔ جواب دہندگان میں سے 10 فی صد نے اپنے اسکولوں میں فارسی زبان پڑھی۔

لسانی رجحان

جواب دہندگان سے جب یہ سوال پوچھا گیا کہ کون سی زبان سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں اور کون سی سب سے کم تو مختلف ردِ عمل پائے گئے۔ 80 فی صد کا کہنا تھا کہ وہ اردو کو سب سے زیادہ پسند کرتے ہیں کیوں کہ یہ ان کی مادری زبان ہے، یہ ان کی تعلیم کی زبان ہے اور اس میں بہت معیاری ادب موجود ہے۔ 20 فی صد جواب دہندگان کا ماننا تھا کہ انگریزی سب سے اچھی زبان ہے کیوں کہ اس کا استعمال انفارمیشن ٹیکنالوجی میں بہت بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ ملازمت حاصل کرنے میں یہ زبان مدد کرتی ہے اور یہ بین الاقوامی زبان ہے۔ ان میں سے بیشتر نے اس سوال کے دوسرے حصے، یعنی کون سی زبان وہ سب سے کم پسند کرتے ہیں، کا جواب دینے سے گریز کیا۔

ابلاغِ عامہ کی ترجیحی زبان

جواب دہندگان سے پوچھا گیا کہ ان زبانوں کا نام بتائیں جن میں وہ اخبار پڑھتے ہیں، ریڈیو پروگرام سنتے ہیں، فلم اور ٹی وی پروگرام دیکھتے ہیں۔ جواب دہندگان کے ردِ عمل درج ذیل ہیں:

	اردو	ہندی	انگریزی
اخبارات	50فی صد	20فی صد	80فی صد
ریڈیو	80فی صد	50فی صد	10فی صد
ٹی وی	60فی صد	60فی صد	20فی صد
فلم	80فی صد	80فی صد	20فی صد

تفریح اور تکنیکی و پیشہ ورانہ معلومات کے لیے

جواب دہندگان سے پوچھا گیا کہ وہ اس زبان کا نام بتائیں جس میں وہ تفریح کے لیے پڑھتے ہیں۔ ردِ عمل بنیادی طور سے اردو کی موافقت میں گیا۔ تفریح کے لیے وہ 70 فی صد اردو میں، 10 فی صد ہندی میں اور 20 فی صد انگریزی میں پڑھتے ہیں۔ پیشہ ورانہ اور تکنیکی معلومات حاصل کرنے کے لیے وہ کس زبان میں پڑھتے ہیں۔ اس سوال کے بارے میں ان کا ردِ عمل بالکل الٹا رہا۔ 90 فی صد انگریزی میں پڑھتے ہیں جب کہ صرف 10 فی صد اردو اور ہندی میں پڑھتے ہیں۔

ترجیحاتِ ملازمت

ملازمت کی ترجیحات کے تعلق سے ان کے ردِ عمل مختلف تھے جو درج ذیل ہیں۔

سرکاری	پبلک سیکٹر	کثیر قومی کمپنی/ صنعت و حرفت	کاروبار
30فی صد	20فی صد	30فی صد	20فی صد

سوال نامہ دوم

والدین سے ان کے نام اور پتے (اختیاری) صوبے، جنس، مادری زبان، دیگر معلوم زبانیں، مقام پیدائش، مقام کاروبار، تعلیمی استعداد، پیشہ، کاروبار میں کون سی زبان استعمال کرتے ہیں، ان کے بچے کون سی زبان پڑھتے ہیں یا مختلف سطحوں پر پڑھ رہے ہیں، مختلف سطحوں پر کون سی زبان ذریعہ تعلیم رہی ہے۔ والدین گھروں میں اپنے بچوں سے کس زبان میں بات کرتے ہیں، وہ اپنے بچوں کے لیے کس قسم کی ملازمت پسند کریں گے، مناسب ملازمت حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے بچوں کے پڑھنے کے لیے کون سی زبان پسند کریں گے اور آخر میں وہ اپنے بچوں کی بہتر نوکری کے لیے اعلیٰ تعلیم میں کس ذریعہ تعلیم کو پسند کرتے ہیں جیسے سوالات پوچھے گئے۔

درج بالا سوالات دلّی کے 30 اردو مادری زبان والے والدین سے پوچھے گئے۔ اردو جاننے کے علاوہ 80 فی صد جواب دہندگان انگریزی، 40 فی صد ہندی اور 10 فی صد فارسی جانتے ہیں۔ ان میں سے 20 فی صد پوسٹ گریجویٹ، 50 فی صد گریجویٹ اور 30 فی صد ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کیے ہوئے ہیں یا کچھ تکنیکی استعداد رکھتے ہیں۔ ان میں سے 40 فی صد سرکاری نوکری کرتے ہیں، 30 فی صد پبلک سیکٹر میں کام کرتے ہیں، 30 فی صد تکنیکی یا پیشہ ورانہ اور نجی کاروبار کرتے ہیں۔ جواب دہندگان اپنے کام

کاج کے مقامات پر زبانی اور تحریری ترسیل کے لیے 80فی صد اردو۔ ہندی اور 20فی صد انگریزی زبان استعمال کرتے ہیں۔ مختلف سطحوں پر ان کے بچے جو زبانیں پڑھتے ہیں درج ذیل ہیں۔

	پرائمری	مڈل	ہائی/ہائر سیکنڈری	کالج
اردو	60فی صد	60فی صد	40فی صد	10فی صد
ہندی	60فی صد	60فی صد	60فی صد	20فی صد
انگریزی	70فی صد	100فی صد	100فی صد	60فی صد

ذریعہ تعلیم زبانیں درج ذیل ہیں:

اردو	30فی صد	30فی صد	30فی صد	20فی صد
ہندی	30فی صد	30فی صد	30فی صد	20فی صد
انگریزی	40فی صد	40فی صد	40فی صد	60فی صد

جواب دہندگان، گھروں میں اپنے بچوں سے بات چیت کے دوران 80فی صد اردو اور 20فی صد انگریزی زبان استعمال کرتے ہیں۔ والدین اپنے بچوں کے لیے درج ذیل نوکریاں پسند کریں گے۔

سرکاری	کثیر ملکی کمپنی	پبلک سیکٹر	تکنیکی
30فی صد	30فی صد	20فی صد	20فی صد

والدین کے مطابق اچھی ملازمت حاصل کرنے کے لیے ہندی، اردو اور انگریزی زبان میں مہارت ضروری ہے۔ مناسب نوکری حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ تعلیم میں انھوں نے انگریزی ذریعہ تعلیم کے استعمال کو ترجیح دی۔

سوال نامہ سوم

سوال نامہ سوم مختلف سیکٹر کے درمیانی سے اعلیٰ درجے کی تنظیموں کے ممکنہ (Potential Employers) سے پوچھا گیا۔ یہ سوالات دلی اور گرد و نواح کے 20 ملازمت دہندگان سے پوچھا گیا۔ جن تنظیموں کے مالکان سے یہ سوالات پوچھے گئے ان میں مرکزی، صوبائی، عوامی شعبے، کثیر ملکی تنظیمیں، ہوٹل، نجی کاروبار کے دفاتر وغیرہ شامل ہیں۔

نام، پتے (اختیاری)، صوبے، تنظیم کی قسم اور نوعیت (علاقائی، قومی یا بین الاقوامی)، کہاں یہ قائم ہیں، ان تنظیموں کی مختلف سطحوں پر کام کرنے کے لیے کس طرح کی لسانیاتی کی ضرورت ہوتی ہے، زبانی ترسیل میں بنیادی طور سے کس طرح کی زبان استعمال ہوتی ہے، بنیادی طور سے کون سی زبان تحریری ترسیل میں استعمال ہوتی ہے۔ وہ اپنے ممکنہ ملازمین سے کون سی زبان میں مہارت چاہیں گے، مختلف سطحوں یعنی خدمات مہیا کرنے، عوامی لین دین، ریکارڈس اور اسٹورس کی دیکھ ریکھ، دفتری مدد، انتظامیہ، تکنیکی اور پیداواری عمل کے لیے کس زبان میں مہارت کو ترجیح دیں گے اور آخر میں کیا وہ اپنی تنظیموں میں سرکاری لسانی پالیسی پر عمل کرتے ہیں جیسے سوالات پوچھے گئے۔

ملازمتوں کے لیے کیسے کم ضروری تعلیمی استعداد کے علاوہ صوبائی حکومت کے دفاتر اپنے ملازمین کی تقرری اور روزمرہ کے دفتری کام کاج میں اپنی اپنی لسانی پالیسیوں پر عمل کرتے ہیں۔ اس معاملے میں کچھ صوبے یقیناً دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سخت ہیں۔ عام طور سے دفتری کام کاج میں صوبے کی سرکاری زبان ہی بنیادی طور سے استعمال ہوتی ہے۔ کچھ معاملات میں دیگر زبانوں کا علم بھی ضروری ہوتا ہے۔

دلی میں ہندی سرکاری زبان ہے، تعلیم اور دوسرے سرکاری شعبوں میں اردو اور پنجابی کو بھی شریکِ کار زبانوں کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ انتظامیہ سرکاری لسانی پالیسی پر سختی سے عمل نہیں کرتی۔ ابتدائی اور اعلیٰ سطحوں پر انتظامیہ کے تقریباً 50فی صد کام کاج بغیر کسی تامل کے انگریزی زبان میں ہوتے ہیں۔

مرکزی حکومت نے بہت واضح سرکاری لسانی پالیسی بنائی ہے۔ ہندی زبان کے زیرِ اثر صوبوں بشمول دلی میں قائم مرکزی حکومت کے سبھی دفاتر انتظامی امور کی تمام سطحوں پر ہندی استعمال کرتے ہیں۔ مختلف قسم کی اسامیوں کے لیے تقرری، تعلیمی استعداد کے مطابق، جس میں لسانی مہارت بھی شامل ہے، کی جاتی ہے۔ مرکزی حکومت کے سبھی ادارے دفتری کام کاج کے لیے سرکاری لسانی پالیسی پر عمل کرتے ہیں۔

دلی اور نواحی علاقوں میں قائم عوامی سیکٹر کی تنظیمیں بالترتیب صوبائی اور مرکزی حکومتوں کی لسانی پالیسیوں پر عمل کرتی ہیں۔ بہر حال مذکورہ اداروں میں کام کے تئیں نرم رویے کی وجہ سے حکومت کی پالیسیوں پر سختی سے عمل نہیں کیا جاتا۔ کثیر قومی اور کاروباری تنظیموں میں کام کرنے کے لیے ہندی اور اردو میں زبانی ترسیل کے ہنر کا علم اور انگریزی زبان کی سبھی بنیادی صلاحیتیں ضروری ہیں کیوں کہ بیشتر کام انگریزی میں ہوتے ہیں۔

غیر سرکاری اداروں کے مالکان سے حاصل کیے گئے امور معلومہ (Data) کے مطابق ہندی اور اردو میں زبانی ترسیل کا ہنر اشد ضروری ہے۔ ان مالکان کے مطابق خدمات مہیا کرنے، عوامی لین دین، اور بعض قسم کے تکنیکی اور پیداواری عمل میں مذکورہ زبانوں کا بنیادی رول ہے۔ غیر سرکاری اداروں کے مالکان اردو اور ہندی میں زبانی ترسیل کی مہارت کے علاوہ انگریزی میں زبانی اور تحریری ترسیل کے ہنر کو کافی اہمیت دیتے ہیں۔

مشاہدات

اس سیکشن کے تحت ہم تین سوال ناموں پر مبنی سروے کے اہم نتائج کی نشاندہی کریں گے اور ان کے پس پشت وجوہ کا پتا لگائیں گے۔

سروے کے اہم نتائج درج ذیل ہیں:

(1) اردو، ہندی اور انگریزی کو ابتدائی اور درمیانی درجوں کی اسکولی تعلیم میں بطور ایک مضمون کے پڑھنے کی ایک عمومی خواہش پائی جاتی ہے۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت دلی میں ہندی پڑھائی جاتی ہے جبکہ پبلک اور نجی اسکولوں میں انگریزی بطور ایک مضمون کے ابتدا ہی سے پڑھائی جاتی ہے۔ اور دیگر اسکولوں میں بطور ایک مضمون کے تیسرے یا چھٹے درجے سے شروع کی جاتی ہے۔

(2) تعلیم کی سطح میں اضافے کے ساتھ انگریزی ذریعہ تعلیم کے استعمال کی ترجیح میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے۔ ابتدائی اسکولی تعلیم میں اردو، ہندی اور انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم ترجیح دی جاتی ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم بہت بڑے پیمانے پر ترجیح دی جاتی ہے۔

(3) گھروں میں بات چیت کے لیے اردو کو بطور بنیادی زبان کے ترجیح دی جاتی ہے۔ گھروں میں بچوں سے بات کرنے کے لیے والدین انگریزی کا بھی استعمال کرتے ہیں۔

(4) ہندستان کی کثیر لسانی صورت حال میں جواب دہندگان کی لسانی مہارت ان کی ایک سے زیادہ زبانوں میں لیاقت کو ظاہر کرتی ہے۔ بیشتر جواب دہندگان نے مادری زبان اردو میں اپنی مہارت کو بمقابل دیگر زبانوں کے بہت بہتر بتایا اور کچھ زبانیں لسانی رابطے کے نتیجے میں انھوں نے سیکھ لیں۔

(5) جواب دہندگان کے لسانی رجحان براہِ راست ان کے جذبات سے متعلق دکھائی دیتے ہیں۔ بیشتر جواب دہندگان اپنی مادری زبان اردو کو سب سے اچھی زبان گردانتے ہیں۔ چونکہ زبان ایک جذباتی مسئلہ ہے اس لیے بیشتر جواب دہندگان نے سب سے کم پسندیدہ زبان کا نام لینے سے گریز کیا۔ شاید فوری افادیت کے فقدان اور وقت طلبی کی بنیاد پر ہی کچھ زبانوں مثلاً فارسی کو سب سے کم پسندیدہ زبان کہا گیا ہے۔

(6) اخبار پڑھنے، ریڈیو سننے، ٹیلی ویژن اور فلم دیکھنے کے لیے زیادہ تر ہندی اور اردو کو ترجیح دی جاتی ہے۔ جبکہ انگریزی فلمیں دوسرے نمبر پر آتی ہیں۔

(7) تفریح کے لیے جواب دہندگان اپنی مادری زبان اردو میں پڑھنا زیادہ پسند کرتے ہیں جبکہ اس کے برعکس پیشہ ورانہ اور تکنیکی معلومات حاصل کرنے کے لیے ان میں سے بیشتر انگریزی میں پڑھتے ہیں۔

(8) سر دست موجود نوکریوں کی پسند کے تعلق سے بہت وسیع اختیارات (Options) ہیں۔ جواب دہندگان شاید تحفظ کی بنا پر سرکاری یا عوامی شعبے (Public Sector) میں نوکری کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ شاید زیادہ تنخواہ کے باوصف دیگر سیکٹروں کے مقابلے میں کثیر ملکی تنظیموں میں نوکری کرنے کی ترجیح میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

کثیر لسانیت کے تناظر میں لسانی ترجیحات سے متعلق نتائج زبانوں کے درمیان تعلق کے نیٹ ورک کی جانب واضح اشارہ کرتے ہیں۔ یہ تعلق سلسلۂ مراتبی (Hierarchical) نہیں ہے۔ ہر زبان کے بولنے والے اپنی زبان کو ایک خاص کرداری شکل عطا کرتے ہیں اور یہ کردار بیشتر افادیت کے اصول پر مبنی ہوتے ہیں جہاں پر عملی اور جذباتی ضروریات ایک ساتھ عمل پیرا ہوتی ہیں۔ افادیت پر مبنی رجحان لسانی ترجیحات کو متاثر کرنے میں ایک ٹھوس وجہ کا کام کرتا ہے۔ لسانی ترجیحات کے پس پشت اہم وجوہ کا براہِ راست تعلق موجودہ تعلیمی نظام اور دیگر ہندستانی زبانوں کے مقابلے میں انگریزی کو میسر رول سے ہے۔

تعلیمی نظام

یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ ہندستان کی تعلیم میں زبان کے خصوصی حوالے سے ملک میں اسکول اور کالج کی سطحوں پر موجودہ تعلیمی منظر نامے کا از سر نو جائزہ لیا جائے۔

ہندستان میں پانچ قسم کے اسکول ہیں۔ سرکاری اسکول، مرکزی اور سینک اسکول، نوودے اسکول، عوامی اسکول اور نجی اسکول۔ دلی میں حکومت کے قائم کردہ سبھی سرکاری اسکول ہندی کو بطور ذریعہ تعلیم استعمال کرتے ہیں۔ مرکزی اور سینک اسکول انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم استعمال کرتے ہیں حالانکہ ہندی کو بھی استعمال کرنے کا اختیار ہے۔ سینٹرل اور سینک اسکول کا قیام مرکزی حکومت نے اپنے ان ملازمین اور فوجیوں کے بچوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کیا ہے جن کا ایک جگہ سے دوسری جگہ تبادلہ ہوتا رہتا ہے تاکہ ان کے بچے ایک ہی قسم کے نصاب، نصابی کتب اور ذریعہ تعلیم میں اپنی پڑھائی جاری رکھ سکیں۔

نئی تعلیمی پالیسی (1986) کی سفارشات کی پیروی میں حکومتِ ہند نے دیہی طلبہ کی تعلیم کے لیے نوودے اسکولوں کا قیام تعلیم کے ایک ماڈل اسکول کے طور پر کیا ہے۔ ان اسکولوں سے توقع کی جاتی ہے کہ ہونہار دیہی طلبہ کا داخلہ کریں اور دیہی و شہری طلبہ کے درمیان معیاری تعلیم کے مواقع کو مساوی بنائیں۔ ان اسکولوں کا بھی ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ دیہی علاقوں

میں انگریزی کو بطور ذریعہ تعلیم کے بڑھاوا دینے میں بھی عملاً انھی اسکولوں کا رول ہے۔

پبلک اسکول نو آبادیاتی (Colonial) روایت کو ہندستان کی تعلیم میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان اسکولوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہے۔ حکومتِ ہند نے اپنے نصاب کی تیاری اور ملازمین کی تقرری میں ان اسکولوں کی خود مختار حیثیت کو اس بنا پر تسلیم کیا ہے کہ یہ اسکول مشترک قومی ثقافت کو فروغ دیتے ہیں اور ہندستان گیر تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ آئینِ ہند کی دفعہ 29 اور 30 کے تحت لسانی اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور چلانے کا آئینی حق حاصل ہے۔ پبلک اسکول متمول طبقے کے بچوں کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں جو ان کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں چونکہ متوسط طبقے کے بچے مہنگے پبلک اسکولوں میں پڑھنے کے مواقع سے محروم ہوتے ہیں یا حکومت کے ذریعے چلائے جا رہے انگریزی میڈیم سینٹرل اور سینک اسکولوں میں ان کی رسائی نہیں ہو پاتی اس لیے متوسط طبقے کی بڑھتی ہوئی تعلیمی خواہشات و ضروریات کے پیشِ نظر پبلک اسکول کے طرز پر پورے ملک میں انگریزی میڈیم پرائیویٹ اسکولوں کے قیام میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے۔

کالج کی تعلیم میں بھی انگریزی کو بہت زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔ ہندستان میں اعلیٰ تعلیم کی صورتِ حال پیچیدہ ہے۔ ہندستان گیر پیمانے کے زراعت، سائنس، ٹیکنالوجی، انتظامیہ اور ادویات کے سر فہرست ادارے موجود ہیں۔ کچھ سینٹرل یونی ورسٹیاں بھی ہیں جن سے اعلیٰ تعلیم کے افضل نمونے پیش کرنے کی توقع کی جاتی ہے۔ متعدد علاقائی اور صوبائی ادارے ہیں جہاں مختلف مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ پبلک اور سینٹرل اسکول کے بیشتر فارغین ہندستان کے سر فہرست اداروں میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ جبکہ دیگر انگلش میڈیم اسکولوں کے فارغین اعلیٰ تعلیم کے علاقائی اداروں میں داخلہ پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ یہی حال مرکزی انتظامیہ میں تقرریوں کا ہے۔ حالانکہ کسی اہم علاقائی زبان کو بطور میڈیم کے استعمال کرنے کا اختیار ہے لیکن بعض وجوہ سے انگریزی میڈیم کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ ایک اہم وجہ یہ ہے کہ معیاری نصابی مواد انگریزی میں موجود ہے۔ ہندستان گیر نوعیت کے اداروں کے موجودہ ذریعہ تعلیم کی مخالفت اور موافقت میں سفارشات پیش کی گئی ہیں۔ ملک کی موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر ذریعہ تعلیم میں تبدیلی سر دست خارج از امکان لگتی ہے۔ تعلیم میں وسعت، انگریزی تعلیم یافتہ طبقے اور دانشوروں کی حمایت، انگریزی کے پھیلاؤ اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں اس کے بڑھتے ہوئے استعمال کے پیشِ نظر آئندہ برسوں میں اس صورتِ حال کے برقرار رہنے کے امکانات ہیں۔

انگریزی کا رول

سوال نامہ اوّل اور دوم کے ذریعے موصول امور معلومہ اسکول اور کالج کی تعلیم میں انگریزی زبان کے بہت اہم رول کو درشاتے ہیں۔ تعلیم کی مختلف سطحوں پر انگریزی بحیثیت مضمون اور انگریزی بہ طور ذریعہ تعلیم کو ترجیح دی جاتی ہے۔ سوال نامہ سوم کے ذریعے موصول امور معلومہ کے مطابق کثیر ملکی کمپنیوں اور نجی کاروبار کے اداروں کے مالکان انگریزی میں زبانی اور تحریری ترسیل کے ہنر کو بہت زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ حکومتی اداروں اور پبلک سیکٹروں میں بھی انگریزی کو ترجیح دی جاتی ہے اور خاص عملی رول دیا جاتا ہے۔ موجودہ تعلیمی نظام کی ضرورتوں اور سائنس و ٹیکنالوجی اور دیگر شعبوں میں بتدریج بڑھتے ہوئے علم کے پیشِ نظر یہ بات بہت اہم ہے کہ مذکورہ علوم کو حاصل کرنے کے لیے ایک زود اثر میڈیم اپنایا جائے۔ دنیا کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں انگریزی کو فائدے مند پوزیشن حاصل ہو چکی ہے۔ سروے کے ذریعے موصول امور معلومہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسکولی اور اعلیٰ تعلیم کی مختلف سطحوں پر انگریزی ذریعہ تعلیم اور انگریزی مضمون بہت مقبول ہیں۔ بہر حال زبان کے پڑھانے کے طریقہ کار کو بہتر بنانے اور مقامی ماحول کے مطابق نصابی مواد تیار کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم میں انگریزی زبان کی اہمیت کو ہندستان میں بخوبی محسوس کیا گیا ہے۔ تعلیم میں اس کا رول بہت زیادہ بدل چکا ہے۔ وہ دن گئے جب انگریزی کو سویدھا کی زبان کے طور پر عہد برطانیہ کے انتظامیہ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اب یہ زبان جدید سائنسی اور تکنیکی علوم، جو معاشی ترقی کے لیے اشد ضروری ہیں، حاصل کرنے کا ذریعہ بن چکی ہے۔ سیاسی مفاد کے لیے انگریزی کو غیر ملکی زبان قرار دے کر چاہے لوگ کتنا ہی جذبات بھڑکانے کی کوشش کریں، تعلیم میں اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقت بازاری قوتیں برسر اقتدار ہیں۔ جدید علوم تک رسائی کے لیے انگریزی کو ایک واحد ذریعے کے طور پر پورے ملک میں قبول کیا جانے لگا ہے اور انگریزی کی یہ پوزیشن آئندہ برسوں میں بھی جاری رہے گی۔

اختتامیہ

اساتذہ، ماہرینِ تعلیم اور رائے ساز لیڈران سے تعلیم میں لسانی ترجیحات سے متعلق سوال ناموں اور انٹرویوز کے ذریعے دلی میں کیے گئے زیرِ نظر سروے متعدد پہلو واضح کرتے ہیں۔

دلی کے سرکاری اسکولوں میں سرکاری زبان ہندی بطور ایک لازمی مضمون کے پڑھائی جاتی ہے اور بطور ایک اضافی مضمون کے کچھ نجی انگریزی میڈیم اسکولوں میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔ کچھ سرکاری اسکولوں میں اردو بطور

ایک متبادل مضمون کے پڑھائی جاتی ہے۔ دتی اور نواحی علاقوں میں لسانی اقلیت کے ذریعے چلائے جارہے اسکولوں میں اردو کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے۔ مرکزی اور صوبائی سطح کی تنظیموں نے اس زبان میں اچھا خاصا تدریسی مواد تیار کیا ہے۔ یہ تنظیمیں زبان کی تدریس کے جدید طریقۂ کار اور نصابی کتب کے استعمال کے لیے برسر کار اساتذہ کے لیے زبان کی تدریس کے تربیتی پروگرام چلا رہی ہیں جن میں بہتری کی پوری گنجائش ہے۔ ملک کے دیگر حصوں کی طرح دتی میں انگریزی تعلیم کے پھیلاؤ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ انگلش میڈیم نجی اسکولوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ یہ اسکول بڑھتے ہوئے متوسط طبقے کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ اس طبقے نے تعلیم میں انگریزی کی اہمیت کو بخوبی محسوس کیا ہے۔ مقامی ماحول سے مطابقت رکھتی ہوئی انگریزی میں ضرورت پر مبنی نصابی کتب تیار کرنے کی پوری گنجائش ہے۔ نصابی کتب کو بنیادی لسانی شعور کے فروغ پر زور دینا چاہیے۔ نصابی کتب، معاون مواد اور لسانی تدریس کے جدید طریقۂ کار بشمول کثیر ذرائع ابلاغ کی تدریس کے لیے انگریزی زبان کے اساتذہ کی تربیت اشد ضروری ہے۔ اسی طرح اعلی تعلیم میں ترقی یافتہ زبانی اور تحریری ترسیل کا ہنر سکھانے کی ضرورت ہے جو طلبہ کی ضروریات سے بامعنی طور پر مربوط ہو۔

دتی حکومت کے ذریعے اپنائی گئی تعلیمی پالیسی میں زبان کا ازسر نو سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ صوبائی حکومت کو حقیقت پسند ہونا چاہیے اور عوام کی ضروریات و خواہشات کا خیال رکھنا چاہیے۔ موجودہ دور میں بازاری قوتیں تعلیم سے متعلق تمام معاملات بشمول ذریعہ تعلیم کے بارے میں طلبہ اور ان کے والدین کی رہنمائی کرتی ہیں۔ پالیسی سازی کے نام پر سیاست داں عوام کو قومیت کے خالی خولی نعروں کے ذریعے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ عوام کے سماجی اور معاشی مفاد کا تحفظ ہونا چاہیے جس میں تعلیم کا بہت اہم رول ہے۔

حواشی

-1 دووا، جس. آر۔ 1996: The spread of English in India: Politics of Language Conflict and Language Power. In fishman, joshua. A (ed). *Contributions to the Sociology of Language*. 72. Berlin: Mouton de Gruyter. (ص557-558)

-2 فیش مان، جوشوا اے 1982: Sociology of English as an Additional. In Kachru, Braj B. (ed) (ص15-22)

-3 کچرو، برج بی. (ed) 1982- *The Other Tongue*: *English Across Cultures* - اربانہ، یونی ورسٹی الینوائس پریس۔

-4 اوم کار۔ ن۔ کول 1983۔ *Language in Education* - Patiala - انڈین انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج اسٹڈیز

-5 اوم کار۔ ن۔ کول (ed)۔ 1992 - English in India:- Theoretical and Applied Issues۔ نئی دلی۔ کریٹیو پبلیشرز۔

-6 اوم کار۔ ن۔ کول۔ 2001 - Language Preference in Education in India مطبوعہ *Language Education in Multilingual India* (مرتبہ) داسوانی۔ سی۔ جے۔ نئی دلی: یونیسکو

□□□

C-13, Greenview Apartments, 33, Sector 9,
Rohini, Delhi-110085

"اردو دنیا" اور "فکر و تحقیق" کے سالانہ خریدار بنیں

"اردو دنیا" اردو کے حال اور مستقبل کا آئینہ ہے ---خود بھی مطالعہ کریں اور اپنے احباب کو بھی اس کے مطالعے کی ترغیب دیں سالانہ قیمت سو روپے بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

National Council for Promotion of Urdu Language, New Delhi

کے نام درج ذیل پتے پر روانہ کریں:

(دہلی سے باہر کے لوگ 110 روپے کا چیک بھیجیں)

ماضی کی علمی بازیافت اور حال کی علمی فتوحات سے واقفیت کے لیے **"فکر و تحقیق"** کا مطالعہ کریں۔ سالانہ قیمت 100 روپے

بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک

National Council for Promotion of Urdu Language, New Delhi

کے نام درج ذیل پتے پر روانہ کریں:

(دہلی سے باہر کے لوگ 110 روپے کا چیک بھیجیں)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066

حسن عبداللہ

عورتوں کے تئیں سماجی رویّے — سماج کے حوالے سے

ارجمند آرا صاحبہ کا مضمون (اردو دنیا، نومبر 2002) "عورتوں کے تئیں سماجی رویے — جرائم کے حوالے سے" بہت پر درد ہے، اور وحشیانہ سماجی رویوں کے تدارک کی بابت سوچنے پر اکساتا ہے۔ مگر، مصنفہ نے مضمون جرائم کے حوالے سے لکھا ہے، اس لیے پہلے "سماج کے حوالے سے" دیکھنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ اول اور آخر تمام سماجی رجحانات اسی سماج کی زمین سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم سماج کا بطور مجموعی احاطہ کریں تاکہ کسی بھی مظہر کی جڑوں کو، اس کے تانوں بانوں کو صحیح طور پر پہچان سکیں۔

بنیادی سوال ہے: اس سماج میں عورت کی کیا حیثیت ہے؟

اس سوال کے جواب میں، میں ایک مزید سوال اٹھانا چاہوں گا۔

جس سماج میں عورت کی جسم فروشی ایک پیشہ، ایک صنعت، مانی جاتی ہو وہاں کیا عورت کی بطور انسان کوئی حیثیت ہو سکتی ہے؟

اور، ہم ساری دنیا پر نظر دوڑاتے ہیں تو پاتے ہیں کہ مفلوک الحال بنگلہ دیش سے لے کر ترقی یافتہ فرانس اور امریکا، ہر جگہ، (اگر کیوبا جیسے دو چار ممالک استثنا ہوں تب میں لاعلم ہوں) عورت کا جسم بیچنا ایک رائج "پیشہ" ہے۔ آخر کیوں؟ آخر ان ممالک میں بھی، جہاں سماجی تحفظ (Social Security) فراہم کیا جاتا ہے؛ بالفاظ دیگر نوکری نہ ہونے کی صورت میں سرکار ضروریات زندگی کی کفالت کے لیے پیسے فراہم کراتی ہے، وہاں پر بھی جسم فروشی کیوں ہوتی ہے؟ اور وہ بھی اتنی کم نہیں کہ اسے متعلقہ افراد کا خلل دماغ کہہ کر نظر انداز کیا جاسکے۔

اور یہی نہیں، فرانس وغیرہ میں تو قحبہ گری کو اب صنعت کا درجہ دیا جاتا ہے اور باقاعدہ ٹریڈ یونینیں، "پیشہ وروں کے حقوق" کے لیے جدوجہد کرتی ہیں۔ آخر کیوں؟ آپ خود 'ہندستان جنت نشان' میں ہی دیکھ لیجیے۔ ایسا نہیں ہے کہ صرف دو وقت کی روٹی کے لیے مجبوری میں ہی عورت جسم بیچتی نظر آتی ہے، یا صرف مرد، زبردستی ہی اس سے اس کی مرضی کے خلاف پیشہ کرواتا ہے۔ ہر طبقے کی عورتیں، ہر زمان و مکاں میں اس لعنت میں گرفتار نظر آتی ہیں۔ آخر کیوں؟ جس طرح ارجمند آرا صاحبہ نے ہر قماش (نظریے نہیں!) کے مردوں کو زنا کے گھناؤنے جرم کا مرتکب دکھلایا ہے (جو کہ صدفی صد درست ہے) اسی طرح ہر قماش کی عورتیں بھی قحبہ گری میں ملوث نظر آتی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ سماجی مسئلے کی جڑیں بہت گہری ہیں، کیوں کہ تب ہی یہ اتنے وسیع پیمانے پر اتنے مختلف سماجوں میں، دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ہر جگہ موجود ہو سکتا ہے۔

دوسرا سوال: وہ کیا بنیادی عوامل ہیں جو عورت کی جسم فروشی یا اس کے زنا کو فروغ دیتے ہیں؟

وہ سماج جو عورت کو بطور جنس پیش کرتا ہے اور برتتا ہے، اور جس میں "یہ میرا ہے" کا فلسفہ اور زیادہ سے زیادہ اپنے لیے حاصل کرنے کی ضرورت سے زیادہ بے ضرورت غیر انسانی جبلت کو فروغ دیا جاتا ہے، جہاں استحصال — ہر کمزور کا — سماج کی بنا ہو، وہاں صنفِ نازک کو کیوں کر برابری کا درجہ دیا جائے گا؟ اور جب تضادات بڑھتے ہیں، بڑے پیمانے پر انتقالِ آبادی ہوتا ہے، بھیڑ میں انسان، گمنام چہرے میں بدل جاتے ہیں، تب عورت کے استحصال کی ایک انتہائی مریضانہ شکل زنا ہمارے سامنے آتی ہے۔ لیکن یہ دیگر امراض سے لاتعلق نہیں ہے، اور نہ ہی دیگر عوامل سے، جو کہ بظاہر اس مرض سے لاتعلق نظر آتے ہیں۔

عورت کے بطور جنس پیش کرنے اور برتنے کا سب سے عریاں مظہر نام نہاد "فیشن صنعت" ہے جہاں اَبرو سنوارنے اور چہرے کی جھریاں دور کرنے پر ساری توجہ مرکوز ہوتی ہو، اور "ملکۂ حسن" بننے کی آرزوئیں لڑکیوں کے دلوں میں موجیں مارتی ہوں، وہاں پر صاف ظاہر ہے کہ نہ صرف یہ کہ عورت جنس بن چکی ہے، بلکہ سماج خود اتنا دیوالیہ ہو چکا ہے کہ خود شکار (victim) نے بھی استحصالی سماج کی، استحصال کرنے والے کی اس سمجھ کو — چاہے لاشعوری طور پر، انجانے میں ہی سہی — قبول کر لیا ہے کہ عورت ایک جنس ہے، اور کوئی بھی جنس، لامحالہ، دیگر اجناس کی طرح بازار میں بیچی خریدی جاتی ہے، اور بازار کے قوانین اس پر لاگو ہوتے ہیں۔

سوال ہے ترجیحات کا۔ جہاں بہتیرے لوگ دو وقت کی روٹی سے محروم ہوں، جہاں نہ جانے اور کتنے ہی سماجی مسائل — سب کے لیے

ایک بہتر زندگی ممکن بنانے کے واسطے — ہماری توجہ کے طلب گار ہوں، وہاں بازار میں ہر مال کو بیچنے کے لیے 'خوبصورت' چہرے کا سہارا لینا اور 'افزائشِ حسن' پر عورتوں کی توجہ کا مرکوز ہونا (جو کہ اس قسم کے سامان کی فروخت سے ظاہر ہوتا ہے) چیخ چیخ کر یہ بتاتا ہے کہ عورت ایک جنس بن چکی ہے۔ ظاہر ہے اس جاندار 'دل و دماغ' رکھنے والی جنس کے ساتھ دیگر اجناس سے قدرے مختلف برتاؤ کیا جاتا ہے — لیکن، بالآخر رہتی یہ جنس ہی ہے۔

ہم سب — مرد اور عورت اور بہت سے بچے بھی — اس سماج میں اپنی قوتِ محنت (labour power) بیچتے ہیں؛ ظاہر ہے، ان کو چھوڑ کر جن کے پاس جائداد یا پیداواری ذرائع ہیں لیکن خرید و فروخت کی اس معیشت میں، انسانوں سے ان کی انسانیت اس حد تک چھن جاتی ہے، وہ اس حد تک اپنے آپ سے بھی بے گانے ہو جاتے ہیں کہ (قوتِ محنت بیچتے بیچتے) وہ اپنی بچ گئی واحد شے یعنی اپنے جسم کو بیچنے میں بھی کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔

جسم بیچنے کی آزادی کے علم بردار یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ہر شخص کو آزادی ہے، وہ جس طرح چاہے اپنی زندگی گزارے۔ جسم فروشی کو جائز ٹھہرانے والے دیگر اشخاص ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ ضرورت کے تحت عورت اس پیشے میں آتی ہے، یا پھر زبردستی لائی جاتی ہے، اور اس کے بعد واپس جانے کا راستہ اس کے لیے بند ہو چکا ہوتا ہے۔

لیکن اس ضمن میں کئی سوالات سر ابھارتے ہیں۔ آخر کیوں کسی کا — اور وہ بھی صرف عورت کا — جی چاہتا ہے کہ وہ اپنی سب سے عزیز اور واحد شے، اپنے جسم کو بیچے؟ کیا سماج اتنا گل سڑ گیا ہے اور ہم اپنے آپ سے اتنے بے گانے ہو گئے ہیں کہ نہ صرف اپنی قوتِ محنت بیچتے ہیں (جس کو بیچنے سے مفر نہیں ہے) بلکہ اپنی عزت، اپنے ذاتی جسم کو بھی بیچنے میں قباحت محسوس نہیں کرتے؟

ضرورت کے تحت قحبہ گری کے پیشے میں آنا، یا زبردستی اس پیشے میں لانا، دونوں ہی باتیں سماج کے منہ پر زبردست کالک ہیں۔ جب آج سماج کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ وہ سب کی ضروریات پوری کر سکے، تب پھر کیوں ان کا اتنا غیر منصفانہ بٹوارا کیا جاتا ہے کہ کسی کو ضرورت کے تحت اس پیشے میں داخل ہونا پڑتا ہے، یا کسی کو زبردستی اس پیشے میں کیوں داخل کیا جاتا ہے۔ (ضمناً ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ سماج مرد کی ایسی نفسیات کیوں کر بناتا ہے کہ وہ — شادی شدہ یا غیر شادی شدہ — انجانی عورت کے ساتھ پیسے کے عوض ہم بستری کرتا ہے۔)

آخری سوال جو اس ضمن میں ہمارے سماج کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ زنا کی شکار عورت کے ساتھ مظلوم ہونے کے بجائے ملزم کی طرح کیوں سلوک ہوتا ہے؟ اس کے لیے سماج کے عام دھارے میں واپسی کیوں ناممکن بنادی جاتی ہے؟ کیا یہ ایک اور اشارہ نہیں ہے کہ عورت کو جنس کے بطور برتا جاتا ہے، نہ کہ انسان کے بطور۔ ہم بیمار کی، چوٹ لگے کی تیمارداری کرتے ہیں، اس کو عضوِ معطل کی طرح کاٹ کر نہیں پھینک دیتے۔ پھر عورت کے ساتھ یہ برتاؤ کیوں؟

استحصال، ہمارے سماج کی بنیاد ہے۔ ہر کمزور کا استحصال، ہمارے سماج کا طرۂ امتیاز ہے اور چوں کہ ہمارے سماجی نظام کی بنیادی اکائی خاندان ہے؛ اور خاندان میں عورت کو 'گھر' کے اندر تک محدود کیا گیا، اس لیے وہ صنفِ نازک بن گئی۔ فریڈرک اینجلس کی تصنیف ''خاندان اور نجی جائداد کا ماخذ'' پڑھنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عورت کیوں کر 'بیچاری' بنی؛ کیوں اس کا استحصال ممکن ہو سکا؟ لیکن آزادیِ نسواں کے نام نہاد علمبردار، جو 'آزادروی' کی سفارش کرتے ہیں، جو بازاری قوتوں اور بازار کے دلدادہ ہیں، وہ عورت کے استحصال کی مختلف شکلوں کے درمیان تعلق سمجھنے سے قاصر ہیں۔

ہمارے سماج کے، سماجی نظام کے، تضادات بڑھ رہے ہیں۔ اسی لیے تشدد (پوشیدہ اور عیاں دونوں) میں اضافہ ہو رہا ہے؛ اسی لیے استحصال اور جبر شدت اختیار کر رہے ہیں، اسی لیے استحصال کی انتہائی مریضانہ شکل، زنا (وہ بھی بلالحاظ عمر و دماغی و جسمانی حالت) ہمارے سامنے آ رہی ہے۔

ہم کو عورتوں کے تئیں سماجی رویے کو بدلنے کے لیے سماج کو بدلنا ہوگا۔ سماج کو بدلنے کے لیے اس کے اندر کارفرما مختلف قوتوں کو سمجھنا ہوگا، کیوں کہ بالآخر سماج کی حرکت کی سمت اور رفتار دونوں کا تعین، مختلف سماجی قوتوں کے وزن پر منحصر ہوتا ہے۔ مختلف استحصالی مظاہر آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، اور رجعت پرست قوتوں کی بالادستی کا مظہر ہیں؛ جب کہ سماجی انقلاب کے لیے ترقی پسند، انقلاب پرور، انسان دوست قوتوں کی بالادستی اور بالآخر استحصالی سماج کا خاتمہ ضروری ہے۔

□□□

44-A, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi-25

معین الدین خاں

بل گیٹس کا دورۂ ہند: مضمرات اور اثرات

دنیا کی ممتاز ترین 28 بلین ڈالر مالیت کی مائیکرو سافٹ (Microsoft) کے چیئرمین اور اس کے Chief Software Architect بل گیٹس کے حالیہ چار روزہ (11 تا 14 نومبر 2002) دورے سے جہاں ملک کو خطیر مالی اعانت اور سرمایہ حاصل ہوا ہے وہیں ان کے مشن اور منصوبے کو لے کر بحث و مباحثے کا بازار بھی گرم ہے۔ ہر کوئی اپنے مخصوص پس منظر اور پیش منظر کے تحت اس کی تشریح اور توجیہہ پیش کر رہا ہے۔

بل گیٹس کا یہ تیسرا دورہ (اس سے قبل 1997 اور 2000 میں انھوں نے بھارت کا دورہ کیا) اب تک کا سب سے طویل دورہ تھا۔ اس بار ان کی آمد سے پہلے ہی تجزیہ کار مختلف اٹکلیں لگانے لگے۔

ملک میں سرمایہ کاری کے سوال کے ساتھ اس بات پر بھی غور و خوض کیا گیا کہ کیا بل گیٹس اپنے 24 بلین ڈالر کے Bill and Milinda Gates foundation سے سماجی بھلائی کے کاموں کے لیے عطیات بھی دیں گے؟

11 نومبر کو اپنے دورے کا آغاز کرتے ہوئے انھوں نے وزیر اعظم سے ملاقات کی اور شام میں پریس کانفرنس میں اس بات کا اعلان کیا کہ ان کے فاؤنڈیشن نے ایڈز (Aids) کی روک تھام کے لیے 100 ملین ڈالر (500 کروڑ روپے) عطیہ دینے کا فیصلہ کیا ہے، اس سے قبل انھوں نے Naz Care Home میں ایڈز کے مریضوں سے ملاقات بھی کی۔ ایڈز کو لے کر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے The Times of India میں لکھا کہ ہندستان گلوبل سوپر پاور (Global Super Power) بننے کا اہل ہے مگر اسے اس مرض سے سخت خطرہ لاحق ہے اور وقت رہتے اس مرض پر قابو نہ پایا گیا تو اس سے ہندستان کی سخت محنت سے حاصل کی گئی کامیابی ملیا میٹ ہو سکتی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق 2001 تک ملک میں ایڈز سے متاثر افراد کی تعداد چالیس لاکھ تھی اور اقوام متحدہ (UNO) اور U.S. National Intelligence Committee کی رپورٹ کے مطابق 2010 تک ایڈز سے متاثر لوگوں کی تعداد دو سے ڈھائی کروڑ ہو سکتی ہے۔ آگے چل کر حقیقی مریضوں کی تعداد کیا ہوگی، اس پر بحث کی گنجائش ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ایک بڑھتی ہوئی آبادی کو جہاں عام طبی سہولیات برائے نام دستیاب ہیں، اس مرض سے سامنا نہیں کرنا ہوگا۔ ہندستان میں امریکی سفیر رابرٹ ڈی بلیک ول (Robert D. Blackwill) کے مطابق اس وقت امریکہ میں 0.6 فی صد آبادی اس مرض سے دوچار ہے جب کہ ہندستان میں یہ شرح 0.8 فی صد ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ امریکہ کی آبادی 28 کروڑ ہے جبکہ ہندستان کی آبادی 100 کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ لہٰذا ہندستانی آبادی کا ایک بڑا حصہ اس کی چپیٹ میں آسکتا ہے۔

ہندستانی آبادی کی ایک اچھی خاصی تعداد کافی حرکت پذیر (mobile) ہے۔ اس وجہ سے یہ مرض ایک جگہ سے دوسری جگہ کافی آسانی اور تیزی سے پھیل سکتا ہے۔ بل گیٹس کے لفظوں میں ہی "یہ ملک ایڈز کی وبا کو روکنے اور اس کو پھیلانے میں گلوبل لیڈر کا رول انجام دے سکتا ہے--- ہندستان اکیلے اپنے بل بوتے پر اس چیلنج کا سامنا نہیں کر سکتا۔" انھوں نے اس بات کی وضاحت کی کہ وہ اس بیماری کی روک تھام کے لیے ہندستانی حکومت کی مرکزی حیثیت کو تسلیم کرتے ہیں اور وہ اس کے نصب العین کے حصول میں اپنا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں لیکن اس عطیے کے اعلان نے کئی ذہنوں میں عجیب و غریب سوالات پیدا کیے۔ کیا بل گیٹس کی اس کرم فرمائی کے پیچھے ان کے اپنے تجارتی مفاد پوشیدہ ہیں؟ اور بعض لوگوں نے تو یہ بھی کہا کہ

Windows بنام GNU/Linux

یہ محض اتفاق ہی ہو سکتا ہے کہ جس دن بل گیٹس دلی پہنچے اسی روز آزاد سوفٹ ویئر تحریک کے ایک سرکردہ گرو Richard Stallman بھی دلی میں براجمان تھے۔ (یہ بھی کم تعجب کی بات نہیں کہ ان کا ذکر میڈیا میں برائے نام ہوا)۔ Free/Libre Open Source Software (FLOSS) تحریک کا اعلان یہ ہے کہ "کمپیوٹر استعمال کرنے والے کو کسی بھی پروگرام کو استعمال کرنے، اس میں تبدیلی کرنے اور بہتر بنانے کے لیے آزادی ہونی چاہیے۔" اس کے لیے ضروری ہے کہ کمپیوٹر پر کام کرنے والے کو اس Software Source code تک بہ آسانی رسائی ہو۔ لیکن مائیکروسوفٹ یہ Code صیغۂ راز میں ہی رکھتی ہے۔ Floss والے Microsoft پر اسی بات کو لے کر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ Patents اور Copy right کے مسئلے کو ایک ساتھ نہیں دیکھتے۔ وہ اس کے لیے Copy left کی اصطلاح وضع کرتے ہیں۔ اس کے تحت پروگرام کو استعمال کرنے والا اپنی ضرورت کے مطابق ترمیم کر سکتا ہے۔ Stallmen نے ہندستانی حکومت سے اپیل کی ہے کہ وہ مائیکروسوفٹ کو اس کے سوفٹ ویئر پیٹنٹ کرانے کی اجازت نہ دے ورنہ

بل گیٹس نے بڑی دوا کمپنیوں میں بھاری سرمایہ کاری کی ہے، لہٰذا وہ مرض کی شدت کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں اور بعض معتبر عہدیداروں نے ان کے اعداد و شمار پر شک و شبہ کا اظہار بھی کیا لیکن اس حقیقت کو پس پشت نہیں ڈالا جاسکتا کہ خود حکومت کے پاس اس مد میں فنڈ کی کمی ہے۔ مرکزی وزارت برائے صحت و خاندانی بہبود کی زیر نگرانی ادارے NACO (National Aids Control Organisation) نے ایڈز کی وبا پر قابو پانے کے واسطے آئندہ پانچ سالوں کے لیے 1455 کروڑ روپے طلب کیے تھے لیکن مرکزی حکومت نے 2002-2003 کے لیے محض 225 کروڑ روپے جاری کیے ہیں۔ (امریکی حکومت نے ہندستان کو ایڈز کنٹرول کے لیے آئندہ پانچ سالوں میں 120 ملین ڈالر دینے کا وعدہ کیا ہے) تو اس صورت حال میں بل گیٹس کے اعلان شدہ عطیے پر شک ظاہر کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ شاستری رام چندرن نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ ''جب عطیہ حاصل کرنے والے کے لیے زندگی جینا ہی سب سے مقدم چیز ہو تب عطیہ دینے والے کے منشا کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔'' حیدرآباد میں بل گیٹس نے زور دے کر کہا کہ Bill and Melinda Gates Foundation کا Microsoft سے کسی قسم کا تجارتی تعلق نہیں ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سماجی بھلائی کے کاموں کو اپنی زندگی کی چھٹی دہائی میں انجام دینا چاہتے تھے لیکن انھوں نے یہ کام پہلے ہی شروع کر دیا (اس وقت ان کی عمر 47 سال ہے)۔ ان کے فاؤنڈیشن نے پچھلے ڈھائی سالوں میں 4.5 بلین ڈالر کا عطیہ دیا ہے لیکن کتنے لوگوں کو ان کی نیک نیتی پر بھروسہ ہے، یہ کہنا بڑا مشکل ہے۔

اپنے دورے کے دوسرے دن بل گیٹس نے صدر جمہوریہ جناب اے. پی. جے. عبدالکلام اور اطلاعاتی ٹیکنالوجی وزیر پرمود مہاجن سے ملاقات کی۔ اس دن گیٹس نے یہاں آئندہ تین سالوں میں 400 ملین ڈالر (200 ہزار کروڑ روپے) کی سرمایہ کاری کا اعلان کیا۔ بنیادی تعلیم، صحت اور دوسری اطلاعاتی ٹکنالوجی کمپنیوں کے ساتھ تعاون اور ہندستانی زبانوں میں سوفٹ ویئر کی تیاری جیسے منصوبوں میں سرمایہ لگانے کی بات کی گئی۔ حیدرآباد میں مقیم Microsoft India Development Centre (MIDC) کی تجدید کاری کا تہیہ کیا گیا اور اب اس میں کام کرنے والوں کی تعداد 200 سے بڑھ کر 500 ہو جائے گی۔

انھوں نے مرکزی حکومت سے اپیل کی کہ وہ ایسے انتظامات کرے جس سے کہ لوگوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر نئی اطلاعاتی ٹکنالوجی سے فیض حاصل ہو سکے اور وہ اپنی زندگی کو بامعنی بنا سکیں۔ پروجیکٹ ''شکشا'' کے تحت پانچ سال میں 35 لاکھ بچوں اور 80 ہزار اساتذہ کو کمپیوٹر کی تعلیم دی جائے گی (کمپنی 2000-09 کو Digital Decade کے طور پر منا رہی ہے)۔ اس کے ساتھ ہی مائیکروسوفٹ ریاستی سرکاروں کی مدد سے دس اطلاعاتی ٹکنالوجی اکادمی قائم کرے گی اور ملک کی گیارہ زبانوں میں Windows XP سوفٹ ویئر متعارف کیا جائے گا (یہ نہیں معلوم کہ اس میں اردو بھی ہے یا نہیں)۔ سردست کمپنی dotnet کی تیاری میں لگی ہے۔ ایک کامیاب تاجر کی طرح نہ صرف گیٹس نے اپنے مصنوعات کی تعریف کی بلکہ یہ بھی کہا کہ ''یہ صرف مائیکروسوفٹ کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ کمپیوٹر صنعت عالمی صنعت کا مقام حاصل کر چکی ہے۔''

لیکن بل گیٹس کی سرمایہ کاری کے اعلان پر بھی سوالیہ نشان لگا۔ سب سے پہلے یہ کہا گیا کہ ان کے سرمایہ کاری منصوبے کے پیچھے ہندستان کا مفاد مقدم نہ ہو کر ان کی کمپنی کا مفاد حاوی ہے۔ بعض حضرات کے مطابق گرچہ اس وقت ہندستان میں کمپیوٹر استعمال کرنے والے کم ہیں لیکن بہت جلد ہی اس ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد میں بھاری اضافہ ہوگا۔ مثال کے لیے اس وقت سبھی اسکولوں میں کمپیوٹر لگائے جا رہے ہیں اور یہ سبھی مائیکروسوفٹ کے سوفٹ ویئر پر انحصار کر رہے ہیں۔ اس طرح سرکاری e-governance سے لے کر اسکول میں لگائے جانے والے کمپیوٹر سے بل گیٹس کو اربوں روپے کی کمائی ہوگی۔ ایک اندازے کے مطابق صرف کیرالا ریاست کے 2600 ہائی اسکولوں میں ہی 37,05,00,000 روپے خرچ

اس کے برے نتائج سامنے آئیں گے اور اب Free Software foundation of India نے تو بل گیٹس کے عطیے اور سرمایہ کاری کے پروگرام کو سرے سے مسترد کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

مائیکروسوفٹ کمپنی کا سوفٹ ویئر Windows ہے اور اس کے Source Code کو صیغۂ راز میں رکھا جاتا ہے اور یہ سوفٹ ویئر کافی مہنگا ہے اور نجی ہاتھوں میں اس کی ملکیت ہونے سے اس بات کا خطرہ برابر بنا رہتا ہے کہ کمپنی کبھی بھی اپنی من مانی کر سکتی ہے۔ اس صورت حال میں ایک ملک ایسے سوفٹ ویئر پر انحصار کرے، تشویش کی بات ہے۔ GNU/Linux ایک Open Source Software ہے اور اس کے استعمال کرنے والی نہ صرف تجارتی کمپنیاں ہیں بلکہ کئی ملک بھی اس سوفٹ ویئر کو اپنا رہے ہیں۔ U.S. Census Bureau نے اس سوفٹ ویئر کے ذریعے محض 4700 ڈالر میں اپنا ویب سائٹ لانچ کیا جب کہ اگر یہ کام Windows کے ذریعے انجام پاتا تو اس پر 3,58000 ڈالر خرچ آتے۔ ادھر چین، جاپان اور پیرو جیسے ممالک Windows کو چھوڑ کر GNU/Linux کو اپنا رہے ہیں لیکن ہندستان میں اس مسئلے پر خاموشی ہے۔ صرف ریاست مدھیہ پردیش GNU/Linux کے متعلق سوچ رہا ہے۔

ہوں گے، اور تو اور یہ کمپنی اپنے کسی بھی سوفٹ ویئر کو، صیغۂ راز میں رکھے گی۔(12 دسمبر کو اکنامک ٹائمس میں شائع خبر کے مطابق، مائیکروسوفٹ Free software تحریک کے چیلنج کے پیش نظر اپنے سوفٹ ویئر کوڈ سے صرف حکومت کو باخبر کرے گی)۔ اس سلسلے میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ایک مخصوص ذاتی ملکیت والے ادارے کے سوفٹ ویئر پر ملک کے تمام بچوں کو تعلیم دے کر کیا ہم خود مائیکروسوفٹ کے محکوم تو نہیں ہو جائیں گے؟ تعلیم سے لے کر معیشت اور حکومت کے ہر دفتر میں اس سوفٹ ویر پر انحصار کسی بھی وقت مشکل کا سامان پیدا کرسکتا ہے (ملاحظہ کیجیے باکس)۔ گرچہ مائیکروسوفٹ کے حامی یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہندستانی اس سوفٹ ویر پر مہارت حاصل کر کے بہتر نوکری کے اہل ہو سکیں گے۔ لیکن یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مائیکروسوفٹ کتنے لوگوں کو نوکری دے پائے گی؟ مائیکروسوفٹ کی سرمایہ کاری کے خلاف دوسری دلیل یہ دی جارہی ہے کہ یہ کمپنی I.T. developers کی ایک بہتر اور بڑی تعداد کو اپنے قبضے میں رکھنا چاہتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کے دس فی صد سوفٹ ویر فروغ دینے والوں کا تعلق ہندستان سے ہے۔ اس پس منظر میں ماہر اقتصادیات رام منوہر ریڈی کا کہنا ہے کہ "اگر ہندستان کے سوفٹ ویر فروغ دینے والے افراد کو اسی نظام سے وابستہ رکھا گیا تو آئندہ کے لیے دوسرے نظام کو فروغ دینے والا طبقہ ہی نہیں بچے گا۔" پھر ہندستانی زبانوں میں سوفٹ ویئر تیار کر کے یہ کمپنی ہندستانی کمپیوٹر صنعت پر اپنا تسلط برقرار رکھنا چاہتی ہے۔

دورے کے تیسرے روز بل گیٹس ممبئی پہنچے جہاں انھوں نے بھارتیہ ودیا بھون کے Gandhi Institute of Computer Educations IT کی تقریبات میں شرکت کی۔ واضح رہے کہ گزشتہ دورے میں انھوں نے غریب اور نادار بچوں کی کمپیوٹر تعلیم کے لیے پانچ ملین ڈالر کا عطیہ دیا تھا۔ اس اسکیم کے تحت 30 ہزار افراد کمپیوٹر شناس بنائے گئے ہیں۔ انھوں نے یہاں کہا کہ میں اس دن کا خواب دیکھ رہا ہوں جب ہر بچے کے ہاتھوں میں ٹکسٹ بکس (Text books) کے بجائے وائرلیس ٹیبلٹ کمپیوٹر (Wireless tablet computer) ہوگا اور وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرسکے گا۔

ممبئی اور دہلی میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے بڑے تجارتی گھرانوں اور صنعتی و کاروباری اداروں کے عہدیداروں سے ملاقات کی۔ Infosys, Tcs, Wipro, Satyam جیسے بڑے اور معتبر کمپیوٹر شعبے کے عہدیداروں سے آپسی لین دین کے کاروبار پر تبادلہ خیال کیا۔ 2000 کے دورے کے دوران جہاں آدھے درجن وزیراعلیٰ ان کو اپنے یہاں سرمایہ کاری کے لیے دعوتیں دے رہے تھے، اس بار اس سے کچھ زیادہ ہی ہوا۔ لیکن بل گیٹس نے واضح لفظوں میں کہا کہ بنیادی سہولیات کی عدم موجودگی میں وہ کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتے اور صرف کمپیوٹر سے ہی سب کو بہت معاشی مواقع حاصل نہیں ہو سکتے۔

اپنے بنگلور قیام کے دوران انھوں نے حکومتِ کرناٹک کے ساتھ ایک MOU (Memoranda of Understanding) پر دستخط کیا جس کے تحت مائیکروسوفٹ e-governance کے کئی پروجیکٹوں پر اپنی سہولیات بہم پہنچائے گی۔ اسکولی تعلیم میں امداد کے علاوہ Banglore One کے تحت شہریوں کو تمام سرکاری کام کاج ایک ہی جگہ پر نمٹانے کی آزادی ہوگی۔ مزید یہ کہ "بھومی' کے تحت زمینی کاغذات کے ریکارڈوں کو Computerised کیا جائے گا اور اس طرح نئی ٹکنالوجی کا ثمر گاؤں تک پہنچ پائے گا۔ (حال ہی میں وزیر اطلاعاتی ٹکنالوجی نے یہ اعلان کیا ہے کہ حکومت ہر سال 30 کروڑ کی مدد سے ہر ریاست کے ایک ضلع کے زمینی کاغذات کو Computerised کرے گی)۔ حکومتِ کرناٹک نے بل گیٹس کو یہ بھروسہ بھی دلایا کہ ریاست میں اس کمپنی کے نقلی سوفٹ ویر فروخت کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

آخری دن بل گیٹس نے حیدرآباد میں گزارا۔ وہاں اپنے فاؤنڈیشن کے ذریعے چلائے جارہے صحتِ عامہ کے پروگراموں کا جائزہ لیا اور ممتاز ایڈیٹروں سے ملاقات کی اور پھر MIDC کا معائنہ بھی کیا۔ انھوں نے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کیا کہ ہندستان ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور ان شکوک و شبہات کو رفع کرنے کی کوشش کی کہ ان کی سرمایہ کاری اور عطیے کے پیچھے کوئی سازش شامل ہے۔ اس دورے میں انھوں نے سرکاری و غیر سرکاری عہدیداروں سے تبادلہ خیال اور بینکنگ کے شعبے اور دیگر PSU کے اعلیٰ افسران سے ان کے شعبے میں اطلاعاتی ٹکنالوجی کی پیش رفت پر بات چیت کی۔

اب تو یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ ان کی سرمایہ کاری اور عطیے سے ہندستانیوں کو فائدہ پہنچا یا نقصان یا دونوں طرح کے اثرات مرتب ہوئے۔ لیکن آج Globalisation کی بڑھتی ریل پیل کے مدِنظر ان کا دورہ ایک نیک شگون ہے خاص طور سے جب بیرونی سرمایہ کاری پر نہ صرف ہمارا انحصار بڑھ رہا ہے بلکہ ہماری اقتصادی میدان میں کامیابی اسی سے طے ہونے لگی ہے۔

□□□

250, Jhelam Hostel, JNU,
New Delhi-110067

رضوان احمد

تفتیشی صحافت — منفی اور مثبت پہلو

گذشتہ سال جب اخبارات میں یہ خبر آئی کہ تہلکہ معاملے میں دفاعی اعلیٰ افسران کو خریدنے کے لیے طوائفوں کا استعمال کیا گیا تھا تو اس پر کافی شور شرابا ہوا۔ صحافتی حلقوں میں بھی اس پر ردِ عمل ہوا کہ صحافت جیسے ذمے دارانہ پیشے کو اس قدر مبتذل بنایا جارہا ہے کہ خبروں کے حصول کے لیے جسم فروش عورتوں تک کا استعمال کیا جارہا ہے۔

اس پر جو اعتراضات ہوئے ان کا جواب دیتے ہوئے تہلکہ کے ایڈیٹر ترون تیج پال کا جواز یہ تھا کہ ان کے رپورٹر دفاعی افسران یا فوجی افسران کے پاس صحافی کی حیثیت سے نہیں گئے تھے بلکہ ان کی حیثیت اسلحوں کے تاجروں کی تھی اور اسی حیثیت سے انھوں نے ٹھیکے حاصل کرنے کے لیے دفاعی افسران کو رشوت دی، اعلیٰ اور مہنگے ہوٹلوں میں شراب کی پارٹیاں دیں، اس کے علاوہ حقائق تک پہنچنے کے لیے جہاں عورتوں کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں قحبہ خانے سے عورتیں منگا کر بھی پیش کی گئیں۔ اس پر کافی لے دے ہوئی اور تفتیشی صحافت کے لیے ایسے مبتذل ذرائع کا سہارا لینے کو عام طور پر پسند نہیں کیا گیا مگر ہمارے ملک کے ایک بزرگ اور سربرآوردہ صحافی خشونت سنگھ نے اس کی پرزور تائید بھی کی۔

کوئی ضروری نہیں کہ ایک صحافی اپنی تحقیق کا جو نچوڑ پیش کرے وہ مبنی بر حقیقت ہی ہو، اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں تفتیشی صحافت نے کئی اہم حقائق طشت از بام کیے اور سماج کی بڑی خدمت انجام دی۔ آٹھویں دہائی میں بھاگلپور کا آنکھ پھوڑ کانڈ اس کی ایک مثال ہے، جب پولیس نے بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زیر سماعت قیدیوں کی آنکھوں میں تیزاب ڈال کر ان کی بینائی ختم کر دی۔ جیل میں یہ حرکت عرصے تک چلتی رہی لیکن پھر ایک نوجوان صحافی ایس این ایم عابدی نے "سنڈے" میں اسے طشت از بام کیا اور اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ "انڈیا ٹوڈے" کی ایک خاتون صحافی مسز پربھاوت نے بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جین وناسپتی کے معاملے میں تفتیش کی کہ وناسپتی گھی کے نام پر عوام کو چربی کھلائی جارہی ہے۔ چونکہ جین برادران کی پہنچ اوپر تک تھی اس لیے سب لوگ اپنے آپ کو بے بس پارہے تھے لیکن مسز پربھاوت نے بہت ہی بے خوفی سے اس کی تفتیش کی کہ کیسے باہر سے گائے کی چربی کے ڈرم منگوائے جارہے ہیں اور ان کو وناسپتی میں ملا کر بیچا جارہا ہے، انھوں نے ان کی تصویریں اتارلیں اور اپنی بے باک رپورٹ کے ساتھ شائع کر دیا۔ یوں پورے ملک میں تہلکہ مچ گیا، ملزم کیفر کردار کو پہنچے لیکن کچھ دن بعد مسز پربھاوت کی لاش ان کے گھر پر مشتبہ حالت میں پائی گئی اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ کتنے ہی سنگین معاملات کو طشت از بام کرنے والی پربھاوت کے بارے میں یہ پتہ نہیں چل سکا کہ ان کی موت کے اسباب کیا تھے اور اس میں کس کا ہاتھ تھا۔

ارون شوری نے بھی تحقیقی صحافت کے ذریعے متعدد راز طشت از بام کیے جن میں مہاراشٹر کے وزیر اعلیٰ عبدالرحمٰن انتولے کے ذریعے پرائیویٹ ٹرسٹ بنائے جانے سے لے کر آبدوزوں کی خریداری، بوفورس توپیں اور چک پستول تک خریدنے کی بات آتی ہے جس میں کمیشن خوری کی گئی۔ "انڈیا ٹوڈے" کے سینئر صحافی فرزند احمد نے اڑیسہ کے بولانگیر ضلع کے کالاہانڈی میں خشک سالی سے اموات اور قحط کے سبب بچوں کی خرید و فروخت کا معاملہ اجاگر کیا، یہاں تک کہ اس وقت کے وزیر اعظم آنجہانی راجیو گاندھی کو خود وہاں جاکر حالات کا جائزہ لینا پڑا۔

اس ذیل میں کئی حربوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً ارون شوری نے مدھیہ پردیش سے ایک عورت کملا کی خریداری کی اور اس مکروہ حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ آج بھی عورتوں کی خرید و فروخت کا گھناؤنا کاروبار ہوتا ہے۔ اڑیسہ کے کالاہانڈی میں بھوک کے سبب اموات کا کافی شور ہوا مگر حکومت کی جانب سے یہ بیان دیا گیا کہ جن کی اموات ہوئیں ان کے یہاں کافی اناج موجود تھا اس لیے انھیں بھوک کے سبب ہونے والی موت نہیں کہا جاسکتا۔ تب 'ہندستان ٹائمز' کے ایک صحافی نے کالاہانڈی کے دو بچوں کو خریدا اور لکھا کہ صرف بھوک کے سبب اموات ہی نہیں ہو رہی ہیں بلکہ ماں باپ غربت کے سبب اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بھی اونے پونے فروخت کر رہے ہیں، تب حکومت کی آنکھ کھلی۔ یوں تو تفتیشی صحافت کی تاریخ قدیم ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ صحافت تفتیش کا ہی دوسرا نام ہے کیوں کہ نامہ نگار تفتیش کرنے کے بعد ہی کوئی رپورٹ رقم کرتا ہے اور اسے اخبار کے حوالے کرتا

ہے۔ لیکن تفتیشی صحافت یا Investigative Journalism کی جو جدید اصطلاح ہمارے یہاں آئی ہے اس کا آغاز ساتویں دہائی سے ہوتا ہے۔ جب 1974 میں واشنگٹن پوسٹ کے باب ووڈ ورڈ اور کارل برنسٹن Bobwodword & Corlbrinston کی تفتیشی رپورٹ نے امریکی صدر رچرڈ نکسن کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے "واٹر گیٹ اسکنڈل" سے موسوم کیا گیا۔ تفتیشی صحافت کی شروعات جدید اصطلاح میں یہیں سے مانی جاتی ہے۔

یوں تو تفتیشی صحافت کی کوئی واضح تعریف موجود نہیں ہے۔ لیکن ڈاکٹر شافع قدوائی اپنی کتاب "خبر نگاری" میں لکھتے ہیں: "تفتیشی رپورٹر کو خبر میں اپنی رائے کے اظہار سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اسے غیر جانبدارانہ انداز میں کھلے ذہن سے معاملے کی تفتیش کرنا چاہیے اور اگر بعد میں کوئی ایسا ثبوت ملتا ہے جو اس کی تفتیش کے موافق نہ ہو تو رپورٹ میں اس کا ذکر کرنا چاہیے۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رکھنی چاہیے کہ اگر کوئی تفتیشی رپورٹ بالکل یکطرفہ اور جانبدارانہ ہے، نیز ثبوت بھی نہیں پیش کیے گئے ہیں تو اس رپورٹ کو سنسنی خیز صحافت کے زمرے میں شامل کیا جائے گا۔ تفتیشی رپورٹ میں ہر چند کہ سنسنی خیزی کا عنصر پایا جاتا ہے مگر اس کا مقصد خبر کو زیادہ دلچسپ بنانا یا اخبار کی تعداد اشاعت میں اضافہ کرنے کی خاطر سنسنی پھیلانا نہیں ہوتا بلکہ اس کا اولیں مقصد معاشرتی اصلاح ہوتا ہے۔"

(خبر نگاری، ص ص-120-119)

مشہور امریکی صحافی مسٹر کلارک. آر. مولن ہوف Clark R Mollin Hoff نے اپنی کتاب تفتیشی خبر نگاری Investigative Journalism میں اس کی اخلاقیات وضع کی ہیں۔

"رپورٹروں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشیں رکھنا چاہیے کہ ایماندارانہ اور اخلاقی تفتیش سیاسی جانبداری سے عاری ہوتی ہے اور اگر کوئی رپورٹر یا اخبار غیر قانونی اور سیاسی طور پر جانبدارانہ یا انصاف کے تسلیم شدہ معیار کے خلاف قدم اٹھاتا ہے تو یہ کاروائی ایک جائز صحافتی تفتیش کے لیے تباہ کن ہوگی۔ غیر قانونی سرگرمی یا بے ایمانی ہمیشہ صحافی اور اخبار کے مطلوبہ مقصد کے لیے نقصان دہ اور خطرناک ہوتی ہے۔ رپورٹر کو یاد رکھنا چاہیے کہ اخلاقیات اور ایمانداری ہمیشہ کام آتی ہے۔"

آج کی چمک دمک اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی صحافت میں اردو اخبار کہیں نظر نہیں آتے۔ وہ اس دوڑ میں سب سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ ان کے وسائل بھی اتنے محدود ہیں کہ تفتیشی صحافت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیکن انھی اردو اخبارات نے اُس وقت تفتیشی صحافت کی اعلیٰ مثالیں قائم کی تھیں جب موجودہ تفتیشی صحافت کے شروع ہونے میں لگ بھگ ایک صدی باقی تھی۔ میں یہاں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ صوفی امبا پرشاد اردو صحافت کا ایک حیرتناک کردار رہے ہیں۔ وہ مراد آباد میں 1858 میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے وکالت کی تعلیم حاصل کی لیکن پیشہ صحافت کا اختیار کیا۔ 1884 میں مراد آباد سے ماہنامہ "جامع العلوم" جاری کیا۔ اس میں باغیانہ مضامین کی اشاعت کے سبب انھیں بار بار جیل جانا پڑا۔ پھر وہ لاہور جاکر تحریکِ آزادی کے ہراول دستے "بھارت ماتا سبھا" میں شامل ہو گئے۔

صوفی امبا پرشاد نے انگریز ریزیڈنٹ کمشنر کے گھر گونگے بہرے بن کر گھریلو ملازم کا کام کیا اور اس کے یہاں سے وہ خفیہ دستاویزات لے اڑے جن میں ہندستان کی تحریک آزادی کو کچلنے کے منصوبے تھے۔ نیز کشمیر کی علاحدگی سے متعلق بے حد خفیہ دستاویزات تھیں۔ صوفی امبا پرشاد نے ان کو اخبارات میں شائع کروا دیا اور نفاذ سے قبل ہی یہ دستاویزات طشت ازبام ہو گئیں۔ اس پر انگریز حکمراں تلملا کر رہ گئے۔ انھوں نے صوفی امبا پرشاد کی سرگرمی سے تلاش شروع کر دی اور وہ زمین دوز ہو کر خفیہ راستوں سے تہران (ایران) پہنچ گئے۔ لیکن وہاں ان کو پہچان کر گرفتار کر لیا گیا۔ انھیں موت کی سزا دی گئی اور فیصلہ کیا گیا کہ سر عام توپ کے دہانے پر باندھ کر اڑا دیا جائے گا مگر جس دن اس سزا کا نفاذ ہونا تھا انھوں نے کال کوٹھری میں یوگا کے ذریعے اپنے آپ کو ختم کر لیا۔ جب سزا کے نفاذ کے لیے سیل کھولا گیا تو ان کی لاش ملی اور اس طرح انگریزوں کی دی ہوئی سزا کی ان پر تعمیل نہ ہو سکی۔

آج جب صحافت دورِ ابتلا میں ہے تو ان زریں کارناموں کا ذکر ضروری ہے کہ ہم ان سے حوصلہ حاصل کریں۔ صحافت میں غیر اخلاقی ذرائع کا سہارا نہیں لیا جانا چاہیے کیوں کہ صحافت مقدس پیشہ ہے۔ یہ محض تجارت نہیں مشن بھی ہے اور اسے مشن کے طور پر ہی انجام دینا چاہیے۔

□□□

Secretary
Bihar Urdu Academy
Urdu Bhawan, Ashok Rajpath,
Patna-800004

اقلیتی تعلیمی اداروں سے متعلق سپریم کورٹ کا فیصلہ

اقلیت، اقلیتی تعلیمی ادارے اور مذہب سے متعلق بعض پیچیدہ سوالات پر عدالتِ عالیہ کی ایک 11 رکنی بنچ نے طویل سماعت کے بعد گذشتہ 30/ اکتوبر 2002 کو اپنا فیصلہ سنایا۔ فیصلے میں کہا گیا ہے کہ حکومت یا متعلقہ یونی ورسٹی کو ان اقلیتی تعلیمی اداروں میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے جن کو سرکاری فنڈ سے مدد نہیں دی جاتی۔ ایسے اقلیتی تعلیمی ادارے طلبہ کے داخلے سے متعلق ضوابط بنانے کے بھی مجاز ہیں لیکن وہ بہر صورت غیر جانب دار اور شفاف ہونے چاہئیں۔ غیر امداد یافتہ اقلیتی تعلیمی اداروں کو کچھ غیر اقلیتی فرقوں کے طلبہ کو بھی داخلہ دینا ہوگا اور ان اداروں کے لیے اساتذہ کے سلیکشن میں تعلیمی لیاقتوں کا تعین حکومت اور یونی ورسٹی کر سکتی ہیں۔ عدالت نے کیپیٹیشن فیس کے بارے میں کہا کہ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو اپنے اخراجات کے لیے فیس لینے کا اختیار ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

تقریباً 320 صفحات کے اس فیصلے سے خاص طور سے اقلیتی تعلیمی اداروں پر کیا اثرات مرتب ہوں گے، اس پر بحث و مباحثہ اور غور و خوض جاری ہے۔ ان صفحات میں فیصلے کے مضمرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

آئینِ ہند میں اقلیتوں کے تعلیمی حقوق

آرٹیکل 29-(1) بھارت کے علاقے میں یا اس کے کسی حصے میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقے کو جس کی اپنی الگ جداگانہ زبان، رسم خط یا ثقافت ہو اس کو محفوظ رکھنے کا حق ہوگا۔

(2) کسی شہری کو ایسے تعلیمی ادارے میں جس کو مملکت چلاتی ہو یا جس کو مملکتی فنڈ سے امداد ملتی ہو داخلہ دینے سے محض مذہب، نسل، ذات، زبان یا ان میں سے کسی کی بنا پر انکار نہیں کیا جائے گا۔

آرٹیکل 30-(1) تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں یا زبان کی اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔

(-1 الف) فقرہ (1) میں محولہ کسی اقلیت کے قائم کردہ اور زیرِ انتظام کسی تعلیمی ادارے کی کسی جائداد کے لازمی حصول کی نسبت کوئی قانون بناتے وقت مملکت اس امر کو یقینی بنائے گی کہ ایسی جائداد کے حصول کے لیے ایسے قانون کی رو سے مقرر یا اس کے تحت تعین شدہ رقم ایسی ہو جس سے اس ضمن کے تحت ایسا حق، جس کی ضمانت دی گئی ہے۔ محدود یا ساقط نہ ہو جائے۔

(2) مملکت تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ کسی اقلیت کے زیر انتظام ہے، خواہ وہ اقلیت مذہب کی بنا پر ہو یا زبان کی۔

عدالتی فیصلے کے چند اہم نکات

- اقلیتوں کو تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کو چلانے کا اختیار ہے لیکن اساتذہ کی لیاقت طے کرنے کا اختیار حکومت کے پاس رہے گا۔
- اکثریتی طبقات کو بھی تعلیمی ادارے کھولنے کا اتنا ہی اختیار ہے جتنا اقلیتی فرقوں کو۔
- حکومت اقلیتی تعلیمی اداروں میں تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے اقدام کر سکتی ہے، خواہ ادارے کو سرکاری مالی امداد حاصل ہو یا نہ ہو۔
- سرکاری امداد یافتہ تمام اقلیتی تعلیمی اداروں پر سرکاری قوانین و ضوابط نافذ ہوں گے۔
- غیر منظور شدہ اقلیتی تعلیمی اداروں کے انتظام میں حکومت یا متعلقہ یونی ورسٹی داخلے میں اہلیت اور تعلیم میں شفافیت لانے کے لیے دخل دے سکتی ہیں۔
- اقلیتی تعلیمی اداروں میں اقلیتی فرقے کے طلبہ کے علاوہ غیر اقلیتی فرقے کے طلبہ کو بھی داخلہ دینا ہوگا۔
- کوئی، کیپی ٹیشن فیس، نہیں لی جائے گی۔

سپریم کورٹ کے فیصلے کا خلاصہ

سوال 1: دستور کے آرٹیکل 30 میں اقلیت کے کیا معنی ہیں؟

جواب: اقلیت کا تعین ریاستوں کی حدود میں نہ کہ ملکی سطح پر کیا جانا چاہیے کیوں کہ دستور میں لسانی اور مذہبی اقلیتیں مساوی حیثیت رکھتی ہیں اور ریاستوں کی تنظیم لسانی بنیادوں پر کی گئی ہے۔

سوال 3 (ب): پروفیشنل تعلیم (میڈیکل و انجینئرنگ وغیرہ) کس حد

● اقلیتی تعلیمی اداروں سے متعلق سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے پر بحث و مباحثہ جاری ہے۔ روزنامہ "راشٹریہ سہارا" نئی دہلی نے "دستاویز" کے تحت کئی بے حد اہم مضامین (17/نومبر/ 2002) شائع کیے ہیں۔ ان مضامین کی دستاویزی اہمیت کے پیشِ نظر انھیں راشٹریہ سہارا کے شکریے کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔

تک آرٹیکل 30 کے تحت اقلیتی حقوق میں شامل سمجھی جاسکتی ہے؟

جواب: چونکہ آرٹیکل 30 میں لسانی و مذہبی اقلیتوں کو اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حق دیا گیا ہے اس لیے اس مرضی میں پروفیشنل تعلیم بھی شامل ہے۔

سوال 4: کیا سرکاری امداد پانے والے یا نہ پانے والے اقلیتی تعلیمی اداروں میں طلبہ کے داخلے کے لیے ریاستی حکومتیں یا یونی ورسٹی جس سے ادارہ ملحق ہے، ضابطہ بنا سکتی ہیں؟

جواب: جو ادارے سرکاری امداد حاصل نہیں کرتے مثلاً اسکول و ڈگری کالج جہاں میرٹ کی بنیاد پر داخلے کی گنجائش کم ہے، ان میں ریاستی حکومتوں یا یونی ورسٹیوں کو مداخلت کا کوئی حق نہیں سوائے اس کے کہ تعلیمی معیار کی برقراری کے لیے کوالیفکیشن کا تعین کرے۔ آرٹیکل 30 کے تحت اقلیتوں کو اپنی مرضی کے تعلیمی اداروں کے انتظام کا جو حق دیا گیا ہے داخلے کا حق اس کا ایک لازمی پہلو ہے اس لیے سرکاری امداد نہ لینے والے اداروں کے اس حق میں سرکار کو مداخلت کا حق نہیں سوائے اس کے کہ اداروں پر شفافیت اور تعلیمی معیار کو ملحوظ رکھنے کی پابندی ہے۔ چونکہ انتظامی حق مطلق نہیں ہے اس لیے خصوصاً پروفیشنل تعلیمی اداروں میں تعلیم کا معیار اعلیٰ درجے کا قائم رکھنے کے لیے سرکاری ہدایات اور ضابطے بنائے جاسکتے ہیں۔

سرکاری امداد حاصل کرنے کی وجہ سے اقلیتی تعلیمی ادارے کی اقلیتی حیثیت ختم نہیں ہوتی۔ اس لیے سرکاری امداد یافتہ اقلیتی ادارے کو اقلیتی طلبہ کے داخلہ کا جو حق آرٹیکل 30 کی رو سے حاصل ہے، وہ جاری رہے گا۔ البتہ ایک معقول حد تک غیر اقلیتی طلبہ کو بھی داخلہ دینا ہوگا جیسا کہ آرٹیکل (2)29 کا تقاضہ ہے۔ ''معقول حد'' کا تناسب ہر صورت میں یکساں ضروری نہیں، اس کا تعین ادارے کی نوعیت، کورس اور اقلیتی تعلیمی ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ریاستی حکومتیں کریں گی۔ اقلیتی طلبہ کے داخلے کے لیے بھی میرٹ کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ سرکاری امداد لینے والے پروفیشنل تعلیمی اداروں میں داخلے کے لیے کسی ریاستی ایجنسی کے ذریعے مشترک داخلے کا امتحان پاس کرنا لازمی کیا جاسکے گا۔ غیر اقلیتی طلبہ کا داخلہ مشترک داخلے کے امتحان اور انٹرویو (جہاں ایسا ہوتا ہو) کے ذریعے ہوگا۔

سوال 5: (الف): کیا اقلیتوں کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کے حق میں، طلبہ کے داخلے کے طریقے اور ضابطے اور انتخاب کا حق شامل ہے؟

جواب: اقلیتی اداروں کو طلبہ کے داخلے کا اپنا طریقہ اور ضابطہ اور انتخاب کا حق ہے لیکن یہ طریقہ شفاف اور منصفانہ ہونا چاہیے اور پروفیشنل اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں طلبہ کا انتخاب میرٹ کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ یہ ملحوظ رہے کہ انتظامی حق استعمال انتظامی گڑبڑ، کے لیے نہ ہو۔ میرٹ کا لحاظ سرکاری امداد نہ لینے والے اداروں خصوصاً مندرجہ بالا نوعیت کے اداروں کو بھی کرنا چاہیے۔

سوال 5(ب): کیا سرکاری امداد حاصل کرنے کی وجہ سے اقلیتی اداروں میں طلبہ کے داخلے کے لیے ضوابط طے کرنے کا حق متاثر ہوگا؟

جواب: امداد دینے والی اتھارٹی کے لیے یہ جائز ہوگا کہ وہ داخلوں کے لیے ذیلی ضابطے اور میرٹ کی بنیاد طے کرنے کے علاوہ غیر اقلیتی طلبہ کے ریزرویشن کا تناسب طے کرے۔ حکومت یا متعلقہ یونی ورسٹی کا یہ حق ہوگا کہ وہ مشترکہ ٹسٹ یا یونی ورسٹی یا متعلقہ تعلیمی ادارے کے ٹسٹ کے ذریعے میرٹ کا تعین کریں۔ امداد دینے والی اتھارٹی کو یہ حق ہوگا کہ وہ پروفیشنل تعلیمی اداروں میں میرٹ کی بنیاد کو یقینی بنائیں۔ ان اداروں میں حکومت یا یونی ورسٹی کو حق ہوگا کہ سماج کے کمزور طبقات کا خصوصی لحاظ کریں۔

سوال 5(ج): کیا ایسے قوانین و ضوابط جن کا تعلق تعلیمی ایجنسیوں اور گورننگ باڈیز پر کنٹرول، یا اقلیتی حیثیت کے تعین یا الحاق کی شرائط یا انھیں واپس لینے کے احکامات اور تدریسی و غیر تدریسی عملہ اور پرنسپل کے تقرر بشمول ضوابط و شرائط ملازمت اور فیس کا تعین ہو، اقلیتوں کو دیے گئے انتظامی حقوق میں مداخلت سمجھے جائیں گے؟

جواب: سرکاری امداد نہ لینے والے تعلیمی اداروں کو زیادہ سے زیادہ انتظامی آزادی ہوگی اور ان میں کم سے کم سرکاری مداخلت ہوگی۔ اگرچہ ان اداروں کو اقلیتی ادارے کے تعین یا الحاق کی شرائط پوری کرنی ہوں گی۔ انتظامی امور بشمول اساتذہ و غیر تدریسی عملے کی تقرری میں اقلیتی انتظامیہ کو زیادہ سے زیادہ آزادی ہوگی اور خارجی مداخلت کم سے کم ہوگی۔ بہر حال اساتذہ کے تقرر اور ان کے خلاف تادیبی کارروائی کے لیے اداروں کے منتظمین معقول ضابطے و معیار مقرر کریں گے۔

تدریسی و غیر تدریسی عملے کے خلاف تادیبی کارروائی اور سزا و ملازمت کی منسوخی کے سلسلے میں شکایتوں و نزاعات کے تصفیہ کے لیے ہر ضلعے میں ٹرائبونل مقرر کیے جاسکتے ہیں اور جب تک ایسا نہ ہو سکے ڈسٹرکٹ جج کی سطح کے کوئی جوڈیشل افسر ایسے ٹرائبونل کی صدارت کر سکتے ہیں۔

بہر حال ریاستی حکومتیں اور دیگر اتھارٹیوں کو حق ہوگا کہ وہ کسی تعلیمی ادارے کے اساتذہ و پرنسپل کے تقرر کے لیے کم سے کم تعلیمی معیار اور تجربہ اور دیگر شرائط جن کا تعلق میرٹ سے ہے کا تعین کریں۔

اسی طرح بہ حیثیتِ مجموعی انتظامی امور میں مداخلت کے بغیر سرکاری امداد لینے والے اداروں کے تدریسی و غیر تدریسی عملے کی ملازمت کے شرائط و ضوابط بنانے کا حق سرکار کو ہوگا۔ امداد نہ لینے والے اداروں میں فیس کا تعین کرنے کا سرکار کو حق نہیں ہوگا لیکن اداروں کو Capitation Fee لینے کا

حق نہیں ہوگا۔

سوال 8: کیا اس عدالت کے ذریعے سینٹ اسٹیفنس کالج کیس (1992) میں طے کیا گیا اصول صحیح ہے؟ اگر نہیں تو کیا حکم ہے؟

جواب: اس کیس میں طے کیا گیا بنیادی اصول صحیح ہے جیسا کہ ہمارے فیصلہ ہذا میں درج ہے۔ بہر حال طلبہ کے داخلے کے لیے کوئی بے لچک لازمی تناسب طے نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا فیصلہ متعلقہ اتھارٹیز پر چھوڑنا چاہیے کہ وہ ادارے کی نوعیت، آبادی اور اقلیتوں کی تعلیمی ضروریات کا لحاظ کرتے ہوئے (اقلیتی و غیر اقلیتی طلبہ کا) تناسب طے کریں۔

سوال 9: کیا اس عدالت کا فیصلہ مقدمہ اُنّی کرشنن بنام ریاست آندھرا پردیش (1993) (سوائے اس حصے کے جس میں پرائمری تعلیم کو بنیادی حق قرار دیا گیا ہے) اور وہ اسکیم جو اس کے تحت مرتب کی گئی نظر ثانی یا ترمیم چاہتا ہے، اگر جواب ہاں ہے تو کیا ہونا چاہیے؟

جواب: اس مقدمے میں اس عدالت کے ذریعے مرتب کردہ اسکیم (سوائے اس امر کے کہ پرائمری تعلیم بنیادی حق ہے) غیر دستوری ہے۔ اگرچہ یہ بات کہ منافع کمانے کی غرض سے Capitation فیس عائد نہ کی جائے درست ہے۔ لیکن ادارے کے توسیعی کاموں کے اخراجات پورا کرنے کے لیے معقول حد تک اضافہ کو منافع کمانا نہیں سمجھنا چاہیے۔

سوال 11: دستور کے مختلف آرٹیکلوں میں "تعلیم" اور "تعلیمی اداروں" کا کیا مفہوم ہے؟ کیا تعلیمی اداروں کے قیام اور ان کے انتظام کے حق کی دستوری ضمانت دی گئی ہے؟

جواب: دستور کے متعلقہ آرٹیکلوں میں "تعلیم" کے مفہوم میں ہر سطح و نوع کی تعلیم، پرائمری سے پوسٹ گریجویٹ تک شامل ہے۔ پروفیشنل تعلیم بھی اسی مفہوم میں شامل ہے۔ اس مفہوم میں "تعلیم" دینے کا کام کرنے والے ادارے تعلیمی ادارے کہلاتے ہیں۔

سارے شہریوں کو آرٹیکل 19(1)(g) اور آرٹیکل 26 کے تحت اور اقلیتوں کو خصوصی طریقے سے آرٹیکل 30 کے تحت تعلیمی ادارے قائم کرنے کے حق کی ضمانت دی گئی ہے۔

سارے شہریوں کو آرٹیکل 19(1)(g) اور آرٹیکل 26 کے تحت جو حق تعلیمی ادارے قائم کرنے اور انتظام کرنے کا دیا گیا ہے، ان پر آرٹیکل 19(6) اور 26(a) کی شرائط کی پابندی لازمی ہوگی۔ بہر حال اقلیتی اداروں کو اقلیتی طلبہ کے داخلے کا حق ہے جس کا طریقہ ہمارے عدالتی فیصلے میں طے کیا گیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد
ایک ہمہ گیر شخصیت
رشید الدین خاں
اس کتاب میں مولانا آزاد کی زندگی کے سوانحی گوشوں پر بہ طور خاص روشنی ڈالی گئی ہے۔
صفحات: 684، قیمت: 58.00

حیات جاوید
الطاف حسین حالی
سرسید احمد خاں کے رفیق کار مولانا الطاف حسین حالی کے قلم سے سرسید احمد خاں کی زندگی کے حالات اور ان کی قومی اور مذہبی خدمات کا بیان ...
چوتھا ایڈیشن
صفحات: 907، قیمت: 167

مولانا ابوالکلام آزاد
شخصیت، سیاست، پیغام
رشید الدین خاں
مولانا آزاد کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے علمی اور عملی کارناموں کا مکمل تعارف ...
دوسرا ایڈیشن
صفحات: 336، قیمت: 76.00

اردو زبان کی تدریس
معین الدین
اردو کیسے پڑھی اور پڑھائی جائے
درس و تدریس کے جدید سائنٹفک اصولوں کی روشنی میں تدریسی طریقۂ کار کا تعین
طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید۔
پانچواں ایڈیشن
صفحات: 148، قیمت: 29.00

ہندوستان کا شاندار ماضی
مصنف: اے ایل باشم
مترجم: سید غلام سمنانی
ہندوستان کے قدیم تہذیب و تمدن کا مفصل اور مکمل تعارف مستند تاریخی شواہد کی روشنی میں
دوسرا ایڈیشن
صفحات: 748، قیمت: 145.00

اتر پردیش کے لوک گیت
اظہر علی فاروقی
ہمارے لوک گیتوں میں ہندوستان کی عوامی زندگی کی بھرپور ترجمانی ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اظہر علی فاروقی نے اتر پردیش کے وہ تمام گیت یکجا کر دیے ہیں جو مختلف موقعوں پر عوام کے دکھ سکھ کی ترجمانی کرتے ہیں
صفحات: 652، قیمت: 120.00

سید طاہر محمود

ہم نے سوچا تھا کہ حاکم سے کریں گے فریاد

ملک کی اعلیٰ ترین عدالت کی ایک بڑی بنچ دستورِ ہند کے تحت اقلیتوں کے تعلیمی حقوق کی صحیح تعبیر و تفسیر کرے گی، یہ خوش آئند بات تقریباً چھ سالوں سے ملکی و بیرونی خبروں میں شامل رہی ہے۔ طویل انتظار کے بعد ساعتِ منتظر آپہنچی اور سپریم کورٹ کی ایک گیارہ رکنی بنچ نے اس ضمن میں اپنا فیصلہ بالآخر اس سال 31/اکتوبر کو سنایا۔ اسی دن سے عدالتِ عظمیٰ کا یہ تازہ ترین فیصلہ ملک کے طول و عرض میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔

اقلیتوں کے تعلیمی حقوق سے متعلق دستوری تجاویز، جنھیں منصف مزاج اور دور اندیش دستور سازوں نے اپنی طرف سے تو بالکل واضح اور غیر مبہم رکھا تھا، روزِ اوّل سے ہی حکومتوں کی تنگ نظری اور نوکر شاہی کے بغض و تعصب کا شکار رہی ہیں۔ چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں ریاستی حکومتوں اور افسروں نے پے در پے نامناسب اقدامات کیے، اور ان اقدامات نے مقدمات اور عدالتی فیصلوں کے ایک لامتناہی سلسلے کو جنم دیا۔ دستوری دور کے ابتدائی دنوں میں تو ملک کی عدالت عالیہ کے فاضل منصفوں نے بڑی فراخدلی اور انصاف پسندی کا مظاہرہ کرکے ان تجاویز کی ان کے اصل منشا کے مطابق دوٹوک تعبیر کی۔ لیکن بعد میں یہ تجاویز قانونی موشگافیوں میں الجھ کر اپنی سیدھی سادی نوعیت اور واضح مفہوم سے رفتہ رفتہ دور ہونے لگیں۔ اس افسوسناک رجحان سے ملک کی اقلیتوں میں بجا طور پر تشویش پیدا ہوئی تو انھوں نے اس کے سدِباب کی ہر ممکن کوشش کی۔ اب سے کوئی دس برس قبل انصاف کی تلاش میں ایک اسلامی تعلیمی ادارے نے ملک کی عدالتِ عالیہ سے رجوع کیا تو معاملے پر غور و خوض کے لیے پہلے ایک پانچ رکنی اور بعد میں ایک سات رکنی بنچ قائم ہوئی۔ اس مرحلے پر اقلیتوں کے حقوق کا درد رکھنے والے بعض اربابِ حل و عقد نے ضرورت محسوس کی کہ ملک کی عدالتِ عالیہ کی ایک اور بھی بڑی بنچ متعلقہ دستوری تجاویز کی ایک بار مکمل اور بھرپور تعبیر کرکے اس معاملے میں خواہ مخواہ پیدا کی گئی پیچیدگیوں اور شکوک و شبہات کو ختم کردے اور انھیں ان کے اصلی اغراض و مقاصد کے مطابق ازسرِ نو نافذ کرائے۔ 1997 کے اوائل میں اس وقت کے چیف جسٹس نے جو خود ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے فرد تھے، اسی مقصد کے تحت سپریم کورٹ کی ایک خصوصی گیارہ رکنی بنچ قائم کی۔ راقم الحروف نے جو کہ اس وقت قومی اقلیتی کمیشن کا صدر تھا، کمیشن کو پارٹی بنائے جانے کی درخواست کرتے ہوئے اس کی طرف سے بہ نفسِ نفیس پیروی کرنے کی اجازت طلب کی۔ افسوس کہ چیف جسٹس موصوف کا یہ اندازہ کہ یہ اہم معاملہ ان کی اس وقت باقی ماندہ تین ماہ کی مدتِ کار میں نپٹ جائے گا، غلط ثابت ہوا۔ ان کی سبکدوشی کے بعد معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا اور ہر چہار طرفہ کوششوں کے باوجود کوئی پیش رفت نہیں ہوئی، حتیٰ کہ راقم الحروف کی اقلیتی کمیشن کی مدتِ صدارت بھی ختم ہوگئی۔ برسوں کی خاموشی کے بعد خصوصی بنچ کی تشکیلِ نو ہوئی اور سماعت شروع ہوئی۔ چند ماہ کے بحث و مباحثے کے بعد فیصلہ بھی آگیا۔ 135 صفحات پر پھیلا ہوا یہ فیصلہ خاصہ پیچیدہ ہے۔ چھ فاضل ججوں کا ایک فیصلہ ہے، باقی پانچ میں سے ہر ایک جج نے اس فیصلے کے بعض نکات یا دلائل سے اتفاق یا اختلاف کرتے ہوئے اپنے الگ الگ فیصلے اور دلائل دیے ہیں۔

اب آیئے پہلے ایک نظر ڈال لیں کہ اس مسئلے پر دستور واقعی کہتا کیا ہے اور کیوں کہتا ہے۔ دستور بنانے والے دانشورانِ قوم صدقِ دل سے اس بات پر متفق تھے کہ جمہوریت چوں کہ اعداد کا کھیل ہوتی ہے اس لیے اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ تعلیم کے میدان میں اقلیتیں اکثریت کے عددی غلبے کے بوجھ تلے دب نہیں جائیں، دستور میں کچھ خصوصی تجاویز شامل کرنا اشد ضروری ہے۔ چنانچہ دفعہ 30 میں دوٹوک اعلان کیا گیا کہ ہر مذہبی یا لسانی اقلیت کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا نظم و نسق چلانے کا اختیار ہوگا اور مزید یہ کہ حکومت تعلیمی اداروں کو امداد دینے میں اس باعث کوئی تفریق نہیں کرے گی کہ کوئی ادارہ کسی اقلیت کے زیرِ انتظام ہے۔ دوربیں و دور اندیش دستور سازوں نے اس اختیار کو دیدہ و دانستہ پوری طرح غیر مشروط رکھا۔ البتہ سابقہ دفعہ میں یہ وضاحت ضرور کردی کہ حکومت سے امداد لینے والا کوئی بھی ادارہ کسی بھی طالب علم کو انفرادی طور پر صرف اس کے مذہب، نسل، ذات یا زبان کی بنیاد پر داخل کرنے سے انکار نہیں کرسکتا۔

سپریم کورٹ کی گیارہ رکنی بنچ کے ضخیم فیصلے کو متعلقہ دستوری دفعات کے اصل منشا، واضح الفاظ اور بین السطور کی روشنی میں دیکھا جائے تو سب سے مناسب اور انصاف کے تقاضوں سے قریب ترین وہ مختصر فیصلہ اور اس کے دلائل ہیں جو ایک فاضل جج صاحبہ محترمہ روما پال نے الگ سے تحریر کیے ہیں۔ انھوں نے صاف کہا ہے کہ دستور کی روشنی میں اقلیتی تعلیمی اداروں میں غیر اقلیتی طلبہ کے لیے پچاس فی صد نشستیں محفوظ کرنے کی گنجائش نہیں ہے جیسا کہ 1990 والے اسٹیفنس کالج والے کیس میں سپریم کورٹ نے غلط طور پر طے کردیا تھا۔ بلاشک و شبہ یہ بات حق و انصاف کے عین مطابق ہے۔ افسوس کہ یہ بات چھ فاضل ججوں کے اکثریتی فیصلے میں نہیں کہی گئی ہے جب کہ اب تو اصل مسئلہ ہی یہی ہے نہ کہ یہ کہ مقامی سرکاریں اقلیتی اداروں کے نظم و نسق میں دخل دیں یا نہیں اور دیں تو کس حد تک۔ کاش کہ محترمہ روما پال کا فیصلہ نافذ

ہو سکتا تو اقوام عالم کے سامنے ملک کے معیارِ انصاف کی دھاک بیٹھ جاتی۔ اکثریتی فیصلے میں بھی بہر حال اتنا تو کہا گیا ہے کہ 1990 والا پچاس فی صد کا عدالتی قاعدہ حتمی نہیں ہے اور حالات کے مطابق اس میں رد و بدل کیا جاسکتا ہے۔ تشویش ناک بات یہ ہے کہ فیصلے میں اس ردّو بدل کا اختیار صوبائی حکومتوں کو دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے اس اعتماد کے ساتھ کہ مذکورہ حکومتیں اس معاملے میں انصاف سے کام لے کر اقلیتی اداروں میں اقلیتی طلبہ کی تعداد پچاس فی صد سے بڑھائیں گی، لیکن کیا ایسا ہو سکے گا جب کہ برسوں کا تجربہ تو کچھ اور کہتا ہے اور کسی اور خطرے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور اب تو جس طرح کی اقلیت دشمن سرکاروں سے سابقہ پڑ رہا ہے ان سے کیا امید رکھی جائے۔ کاش کہ اکثریتی فیصلے میں ان زمینی حقائق پر نظر رکھی گئی ہوتی۔ اس کے برعکس اس فیصلے میں تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ سرکاری امداد نہ لینے والے اقلیتی اداروں کو بھی "کچھ" غیر اقلیتی طلبہ کو داخلہ ضرور دینا چاہیے۔

یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ قومی اتحاد کی خاطر اقلیتی اداروں میں غیر اقلیتی طلبہ کی موجودگی کی تو اتنی فکر، لیکن غیر اقلیتی اداروں میں اقلیتی طلبہ کس حد تک ہوتے ہیں یا پہنچ پاتے ہیں اس کی کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ آج تک کسی عدالتی فیصلے میں اس بارے میں ایک حرف بھی نہیں کہا گیا ہے۔ فکر تو اس کی زیادہ ہونی چاہیے کہ قومی اتحاد اور انصاف دونوں کا یہی تقاضہ ہے۔ ملک بھر میں DAV (دیانند اینگلو ویدک)، سناتن دھرم اور ہندو کالج اور اسکول چل رہے ہیں، ان میں اقلیتی طلبہ کا کیا تناسب ہے؟ اور انھیں تو جانے دیجیے، سو فیصد سرکاری خرچ پر چلنے والے لاکھوں غیر طبقاتی تعلیمی اداروں میں کتنے اقلیتی طلبہ پہنچ پاتے ہیں؟ ملک کے عام تعلیمی اداروں میں کتنے اقلیتی طلبہ پہنچ پاتے ہیں؟ ملک کے عام تعلیمی اداروں میں اقلیتوں کا تناسب ان کی آبادی کے لحاظ سے بے حد کم ہے اور بسا اوقات صفر ہوتا ہے۔ یہ حقیقت 1983 کی گوپال سنگھ کمیٹی رپورٹ، 1996 کی ورداراجن کمیٹی رپورٹ اور اقلیتی کمیشن کی متعدد رپورٹوں سے مصدقہ ہے۔ اس جانب آج تک کسی عدالتی فیصلے میں نظر کیوں نہیں گئی، یہ ایک معمہ ہے، سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔

موجودہ قانون یہ ہے کہ کوئی اقلیت اگر اپنے افراد کے خون پسینے کی کمائی سے اپنے پچاس بچوں کو پڑھانے کے لیے کوئی ادارہ قائم کرے تو سرکاری امداد جبھی مل سکے گی جب اس میں اتنے ہی بچے دوسرے طبقوں کے بھی لازماً داخل کیے جائیں اور ساتھ ہی شیڈولڈ کاسٹ کے لیے رزرویشن بھی کیا جائے (جب کہ کوئی اقلیتی فرد تو ہرگز اس زمرے میں آ ہی نہیں سکتا) سرکاری امداد اگر برائے نام، دس فیصد یا اس سے بھی کم ہوگی تب بھی اقلیتی طلبہ کی مقررہ تعداد اتنی ہی رہے گی۔ اس کے برعکس اکثریت یا خود سرکار اگر کوئی ادارہ قائم کرے تو اس میں اقلیتی طلبہ کے لیے کوئی ایک واحد جگہ تک محفوظ نہیں کی جاسکتی کیوں کہ یہ تو "غیر دستوری" ہوگا۔ چندر گپت و کرماجیت کی تاریخی کرسئ انصاف اور روایتی عدلِ جہانگیری کے وارث اس ملک کے دورِ جدید میں عدل و انصاف کا یہی منظر نامہ ہے اور سپریم کورٹ کا تازہ فیصلہ اسے بدلنے میں کسی طرح معاون نہیں ہوگا۔ سوال یہ بھی ہے کہ ملک کی عدالت عالیہ کی اتنی بڑی بنچ کے سامنے یہ معاملہ لے کیوں جایا گیا تھا؟ اسی لیے تاکہ ہر بات صاف ہو جائے، کوئی پہلو مبہم نہ رہے، تو کیا یہ مقصد پورا ہوا ہے؟ عدالت نے خود ہی موضوع سے متعلق گیارہ سوالات مرتب کیے تھے۔ ان میں سے چار کے تازہ فیصلے میں کہا گیا ہے کہ ان کا جواب خصوصی بنچ کو دینے کی ضرورت نہیں، کوئی "ریگولر" بنچ دے گی۔ باقی سات سوالات کے جواب یوں دیے گئے ہیں کہ بہت سی چیزوں کا فیصلہ صوبائی سرکاروں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کون سے فرقے کہاں اقلیت میں ہیں، یہ صوبائی سرکاریں طے کریں گی۔ سرکاریں ہی یہ بھی طے کریں گی کہ کس اقلیتی ادارے میں کتنے غیر اقلیتی طلبہ ہونے لازمی ہیں (البتہ انھیں اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا کہ کس غیر اقلیتی ادارے میں کتنے اقلیتی طلبہ ہیں) ریاستی سرکاروں پر دستور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے معاملے میں اتنا بھرپور اعتماد؟ اور جو سرکاریں رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں دستور اور قانون کی کھلے عام دھجیاں اڑتے دیکھ کر فکر فکر دیدم دم نہ کشیدم، کی تصویر بن جاتی ہیں، ان پر بھی اتنا بھروسہ؟ راقم کی ناچیز رائے میں عدالتِ عالیہ کو یہ سب باتیں مقامی سرکاروں کے معیارِ انصاف پر چھوڑ دینے کے بجائے خود ہی حتمی طور پر طے کر دینا چاہیے تھا کہ اس اہم دستوری معاملے کو اتنی بڑی عدالتی بنچ کے سامنے لے جانے کا مقصد یہی تھا۔

تازہ عدالتی فیصلے سے الجھنیں کم نہیں ہوئی ہیں، مزید بڑھ سکتی ہیں اور بڑھیں گی۔ اقلیتیں ملک کی عدالتِ عظمیٰ سے مسیحائی کی منتظر تھیں، ان کی فریاد ہنوز کشتۂ ساعت ہے۔ نافذ العمل فیصلہ بہر حال چھ فاضل ججوں کا ہے، ہر نکتے پر گیارہ ججوں کا متفقہ فیصلہ نہیں۔ امید کی جاسکتی ہے کہ اس فیصلے کے بعض نکات پر آئندہ کبھی ایک اور بھی بڑی بنچ نظر ثانی کر سکے گی۔ آخر اسی فیصلے نے سپریم کورٹ کے ایک سابقہ فیصلے (بمعاملہ اونی کرشنن 1993) کو جزوی طور پر "غیر دستوری" اور ایک دوسرے سابقہ فیصلے (بمعاملہ اونی کرشنن 1990) کو "غیر حتمی" بھی تو قرار دیا ہے، تو خود اس فیصلے کے ناقابلِ اطمینان پہلوؤں پر بھی آئندہ نظر ثانی کا دروازہ کیوں بند کیا جائے اور اس نظر ثانی کے لیے خود اسی عدالت کے بعض پرانے فیصلے اور اس کی اسی بنچ کی ایک معزز رکن محترمہ جسٹس روما پال کے اسی فیصلے کے ضمن میں دیے گئے دلائل مشعل راہ بن سکتے ہیں۔ ان پر بے شک غور کیا جانا چاہیے کہ اس تازہ فیصلے کی نوعیت تو جناب آلِ احمد سرور کے الفاظ میں ذرا سی تبدیلی کے ساتھ یہی ہے کہ

جام پی کر بھی وہی تشنہ لبی ہے ساقی
لطف میں تیرے بڑی کوئی کمی ہے

□□□

اسحاق جم خانہ والا

فیصلہ مسئلے کا قطعی حل نہیں

ہمارے ملک میں اقلیتی تعلیمی اداروں کے وجود پر کافی شور و غوغا مچا رہا ہے لیکن اس موضوع پر سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کو سمجھنے کے لیے ہمیں ہندستان میں ایسے اداروں کے پس منظر اور ان کی تاریخ میں جھانکنا ہوگا۔ اس کی تاریخ 1857 سے شروع ہوتی ہے جب انگریزوں کے خلاف پہلی جنگِ آزادی شروع ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے بیرونی حکمرانوں کے خلاف احتجاج کیا اور انگریزی زبان کا بائیکاٹ کیا جو بقول ان کے، ان کی ثقافت اور روایات کے لیے انتہائی مضر تھی۔ انھوں نے اس حقیقت کے خلاف بھی اپنے غم و غصے کا اظہار کیا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی ہی مغل حکومت کے زوال کے لیے ذمے دار تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں فرقوں نے مل کر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو اپنی جدوجہدِ آزادی کا سمبل بنایا۔

برطانیہ نے اس عمل کے لیے مسلمانوں کو کبھی معاف نہیں کیا۔ نہ صرف ان کی اس وقت سختی سے سرزنش کی گئی بلکہ مسلمانوں کو مین اسٹریم سے ختم کرنے کے لیے ایک منظم مہم بھی شروع کی گئی۔ بڑی تعداد میں مسلمان گرفتار کیے گئے اور متعدد علمائے دین کو تختۂ دار پر لٹکادیا گیا۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے ایک فتویٰ جاری کیا کہ انگریزی زبان سیکھنا ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ لیکن اسی دوران ہندوؤں نے انگریزی زبان سیکھنی شروع کی اور بڑی تعداد میں حکومتِ برطانیہ کے دفاتر میں کام کرنے لگے۔ اس طرح مسلمان جدید تعلیم اور روزگار کے حصول میں پیچھے رہ گئے۔ ان کی حالت قابلِ رحم ہوگئی۔ اس زمانے میں بانیِ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سرسید احمد خاںؒ نے یہ محسوس کیا کہ جب تک مسلمان جدید تعلیم حاصل نہیں کرتے ان کی اقتصادی حالت نہیں سدھر سکتی۔ انھوں نے مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنے اور انگریزی حکومت کی تقریبات میں شرکت کرنے کی تلقین کی۔ ان کے خلاف فتویٰ بھی جاری ہوا لیکن وہ اپنے موقف پر قائم رہے۔

جنوب میں جسٹس بدرالدین طیب جی (بانیِ انجمن اسلام اور ممبئی ہائی کورٹ کے پہلے ہندستانی جج) نے تعلیمی مہم شروع کی۔ ان ہی قائدین کی کاوشوں کے نتیجے میں مسلمان دھیرے دھیرے مین اسٹریم میں شامل ہونا شروع ہوئے لیکن 1857 کی لڑائی اور اس کے بعد انگریزوں کی سازشوں نے مسلمانوں کو ملک کے دیگر فرقوں سے کم از کم 50 سال پیچھے کردیا تھا۔

آزادی کے بعد ہندستان کے آئین سازوں نے محسوس کیا کہ ہندستانی مسلمانوں کی حالتِ زار کا خاص سبب ان کی جہالت اور ناخواندگی ہے۔ چنانچہ انھوں نے آرٹیکل 29 اور 30(1) میں خصوصی التزام رکھا کہ تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں یا زبان کی، اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔ حکومت ایسے اقلیتی تعلیمی اداروں کو مالی مدد فراہم کرتی ہے۔ مسلم مخالف طبقہ اس کو مسلمانوں کی منھ بھرائی (Appeasement of Muslims) قرار دیتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اقلیتی فرقے (مذہبی اور لسانی) میں عیسائی، پارسی، جینی اور سندھی بھی شامل ہیں اور وہ بھی سرکاری مراعات حاصل کرتے ہیں۔ لیکن چوں کہ دیگر اقلیتیں اقتصادی اعتبار سے مضبوط اور بہتر منظم ہیں، وہ اپنے اقلیتی ادارے کامیابی سے چلاتی ہیں جب کہ مسلمان آپس میں ہی لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ اس سے ریاستی حکومتیں متوجہ ہوئیں اور انھوں نے ان کے اداروں کے انتظام وانصرام میں دخل دینا شروع کردیا۔ مسلمانوں کے ذریعے قائم کردہ اور چلائے جانے والے تعلیمی اداروں کو اقلیتی اسٹیٹس دینے سے ریاستی حکومتوں کے گریز کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر انجمنِ اسلام ایک نیا کالج کھولنا چاہتی ہے، اس کے لیے اقلیتی اسٹیٹس حاصل کرنے کے لیے ہمیں کافی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔

گذشتہ برسوں میں کئی اقلیتی تعلیمی اداروں نے مختلف مسائل کے حل کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ آخر کار جسٹس بی این کرپال کی سربراہی میں 30 سال میں اب تک کی سب سے بڑی 11 رکنی بنچ نے تمام مسائل کا ایک ہی بار ہمیشہ کے لیے حل تلاش کرنے کا عمل شروع کیا۔ متعدد امور پر غور وخوض ہوا اور اس کے بعد جو فیصلہ آیا ہے اس سے ہندستان میں اقلیتی تعلیمی ادارے چلانے کے سلسلے میں دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔ تاہم ذاتی طور پر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مسئلے کا یہ قطعی حل نہیں ہے بلکہ ان معاملات میں عدالتوں سے رجوع کرنے کا سلسلہ ابھی جاری رہے گا۔

سپریم کورٹ نے کہا ہے کہ سرکاری امداد نہ حاصل کرنے والے ادارے بھی کیپی ٹیشن فیس نہیں لیں گے، میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں کیوں کہ بہت سے لوگ محض دولت کا استعمال کرکے طلبہ اور ان کے والدین کا استحصال کرتے رہے ہیں۔ عدالت نے یہ بھی کہا ہے کہ ریاستی حکومت اور یونی ورسٹی طلبہ کے داخلے میں مداخلت نہیں کرسکتی، اگر داخلے کا عمل شفاف

ہے اور اہلیت کا خاص طور سے دھیان رکھا جارہا ہے۔ یہ بھی بہت ہی مثبت بات ہے۔ یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ انجمنِ اسلام 14 غیر امداد یافتہ پروفیشنل کالج چلاتی ہے۔ ہمارے طلبہ میں 40 فی صد سے زیادہ غیر مسلم ہیں اور عملہ کا بھی تقریباً 45 فی صد دوسرے فرقوں سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا یہ سیکولرزم کی مثال نہیں ہے؟

لیکن امداد یافتہ اقلیتی تعلیمی اداروں کو اپنے فرقے کے 50 فی صد امیدواروں کو داخلے دینے کے کوٹے کی سپریم کورٹ کے ذریعے تنسیخ کرنا (سینٹ اسٹیفنس کالج کا کیس 1990) مسائل کو مزید الجھا سکتا ہے۔ جج کا کہنا ہے کہ "حکام ادارے کی نوعیت اور اقلیتوں کی آبادی اور تعلیمی ضروریات کو مدِنظر رکھ کر مناسب فی صد کا تعین کریں گے" میں سمجھتا ہوں کہ ضرورت سے زیادہ خوش فہم سرکاری افسران اس حکم سے ابتری کی صورت حال پیدا کرسکتے ہیں اور اس طرح عدالتوں سے ایک بار پھر رجوع کیا جاتا طے ہے۔ اس کے علاوہ غیر امداد یافتہ اقلیتی تعلیمی اداروں میں اساتذہ کے تقرر میں بھی براہِ راست سرکاری مداخلت ہو جائے گی۔

اس معاملے میں 11 سوال قائم کیے گئے تھے۔ ان میں سے یہ سوال کہ "کسی مخصوص مذہبی فرقے کا ایک گروپ یا فرقے کے پیروکار کیا 30(1) کے تحت کسی ریاست میں اکثریت میں ہونے کے باوجود اقلیتی فرقے کا ہونے کی وجہ سے تحفظ مانگنے کا دعویٰ کرسکتے ہیں؟" کا جواب دینے سے عدالت نے گریز کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ معاملہ کبھی نہ کبھی پھر ضرور اٹھے گا۔

فیصلہ مجموعی طور پر لائقِ خیر مقدم ہے لیکن مذہبی اقلیتوں کے ذہنوں میں خدشات ہیں کہ ان کے تعلیمی اداروں میں حکومت کی مداخلت آئین کے آرٹیکل 29 اور 30 کے تحت ان کے حقوق سے متصادم ہوگی۔

□□□

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़–ए उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of HRD, Dept. of Secondary & Higher Education, Govt. of India
West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110 066.
Ph.: 6109746, 6169416 Fax: 6108159 E-mail: urdueducation@hclinfinet.com

کتابوں کی نمائش و فروخت
آپ کے شہر آپ کے گاؤں میں

موبائل وین سے اردو کتابوں کی نمائش و فروخت کے تجربے میں اتر پردیش میں ہمارے اردو قارئین نے جس جوش و خروش سے کتابیں خریدیں اور کتب بینی کی روایت میں نئی روح پھونکی اس نے کونسل کے دلولے دوبالا کیے ہیں۔ بہار اور جھارکھنڈ کی دور دراز اردو بستیوں میں آپ کے ہاتھوں تک اردو کا سرمایہ پہنچانے کے لیے یہ موبائل وین اب حسبِ ذیل پروگرام کے مطابق آپ کی بستی میں پہنچے گی:

20 تا 22 دسمبر	کشن گنج	30 تا 31 دسمبر	مونگیر	8 تا 9 جنوری	ہزاری باغ
23 تا 24 دسمبر	پرنیہ	2 تا 3 جنوری	گریڈیہہ	10 تا 11 جنوری	رانچی
25 تا 26 دسمبر	کٹیہار	4 تا 5 جنوری	دھنباد	12 تا 13 جنوری	جمشید پور
27 تا 29 دسمبر	بھاگل پور	6 تا 7 جنوری	بوکارو	15 تا 16 جنوری	ڈالٹن گنج

نوٹ : شناختی کارڈ دکھانے پر اساتذہ اور طلبہ کے لیے 40% رعایت

شمیم فیضی

سپریم کورٹ کا فیصلہ

ہندستان کی عدالتِ عالیہ نے 31/اکتوبر کو اقلیتی تعلیمی اداروں کی حیثیت کے بارے میں ایک تاریخی فیصلہ دیا ہے۔ 300 سے زیادہ صفحات پر مشتمل یہ فیصلہ سپریم کورٹ کی 11 رکنی بنچ نے دیا ہے، مگر یہ فیصلہ متفقہ نہیں ہے۔ چیف جسٹس بی این کرپال (وہ اب سابق چیف جسٹس ہو چکے ہیں) نے جو فیصلہ سنایا اس سے 7 ججوں نے اتفاق کیا ہے جب کہ 4 ججوں نے الگ الگ رائے دی۔ اس میں سے دو ججوں جسٹس ایس ایس ایم قادری اور جسٹس روماپال کے فیصلوں کو ان معنوں میں اہم کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے بنیادی سوالوں پر اکثریتی فیصلے سے اختلاف کیا ہے ورنہ بحیثیتِ مجموعی اسے سپریم کورٹ کی متفقہ رائے قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس فیصلے کے دیگر مضمرات سے بحث کرنے سے پہلے اختلاف کرنے والے دو ججوں کی ان آراء سے واقف ہونا ضروری ہے۔

جسٹس قادری نے اکثریتی فیصلے سے اس نکاہ میں اختلاف کیا ہے کہ دستور ہند کے مطابق اقلیتوں کے حقوق حتمی ہیں یا نہیں؟ اکثریتی فیصلے میں کہا گیا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق حتمی نہیں ہیں جب کہ جسٹس قادری کا خیال ہے کہ دستور ہند کا جو مزاج ہے اس کے مطابق اقلیتوں کے حقوق حتمی ہیں اور مملکت ان میں مداخلت نہیں کر سکتی۔

اسی طرح جسٹس روماپال نے اپنے فیصلے میں کہا ہے کہ اقلیتی اداروں میں غیر اقلیتی طلبہ کے داخلے کے بارے میں ریاست یا انتظامیہ کے اختیارات کی توسیع غیر دستوری ہے۔ اگر غیر اقلیتی طلبہ کے داخلے کے تناسب کے تعین کا اختیار انتظامیہ کو دے دیا گیا تو اس سے اقلیتوں کے حقوق پر تحدیدات کی راہ ہموار ہو جائے گی۔ ایسا کرنا، دستور ہند میں دیے گئے اقلیتی حقوق کی خلاف ورزی ہوگی۔

سپریم کورٹ کے ان دو ججوں جسٹس قادری اور جسٹس روماپال کے اختلاف کی اپنی معنویت ہے، مگر بحیثیتِ مجموعی اکثریتی فیصلے سے ان کا اختلاف فیصلے کی عمل آوری میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کرتا۔ اس اختلاف کو قانونی موشگافی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے مگر اس سے سپریم کورٹ کے فیصلے کی نوعیت نہیں بدلتی۔ اس لیے اس فیصلے کے مضمرات کا جائزہ لیتے وقت اس کے مجموعی اثر کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔

بحیثیتِ مجموعی سپریم کورٹ کے فیصلے کے جائزے سے پہلے یہ اعتراف ضروری ہے کہ موجودہ مضمون نگار، ماہر قانون نہیں۔ اس لیے اس تاثر کی قانونی یا دستوری حیثیت مشتبہ ہو سکتی ہے مگر اس فیصلے کی نفسیاتی اور فلسفیانہ حیثیت کے بارے میں یہ مضمون نگار پُر اعتماد ہے۔

عدالتِ عالیہ کا یہ تاریخی فیصلہ دو لحاظ سے موجودہ فلسفیانہ اور سیاسی فہم کے عین مطابق ہے۔ سپریم کورٹ کے جج صاحبان، سماج سے بالاتر نہیں ہیں اس لیے ان کا سماج کے غالب معاشی، سیاسی نظریے سے متفق ہونا فطری ہے۔ اس فیصلے میں بھی سپریم کورٹ کے جج صاحبان نے غالب معاشی اور سیاسی نظریے کی طرف داری کی ہے۔

سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں 1993 کے اس فیصلے کو "غیر دستوری" قرار دیا ہے جس میں کہا گیا تھا کہ تعلیمی نظام کو تجارتی بنانا، دستور ہند کے منافی ہے۔ 1993 میں عدالتِ عالیہ نے تعلیمی نظام کو تجارتی بنانے کی مزاحمت کرتے ہوئے پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں میں داخلے کے لیے مالی حیثیت اور اضافی فیس کو غیر قانونی قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ مالی حیثیت کی بنیاد پر داخلے کی اجازت دستور ہند میں دیے گئے مساویانہ حقوق کی خلاف ورزی ہوگی۔ عدالتِ عالیہ کا یہ فیصلہ گذشتہ نو برسوں میں دستور ہند کی حتمی صراحت کی حیثیت سے نافذ رہا مگر اب عدالتِ عالیہ نے تعلیمی نظام کو تجارتی بنانے کی اجازت دے دی ہے۔ حالاں کہ تعلیمی اداروں میں 'منافع خوری' کی اجازت دینے کی ممانعت کی گئی ہے مگر اضافی وسائل کے حصول کے لیے زیادہ فیس کے تعین کو جائز ٹھہرایا گیا ہے۔ اس طرح عدالتِ عالیہ نے تعلیم کو بازار کے معاشی اصول کے ماتحت بنا دیا ہے۔ اگر آپ رقم ادا کر سکتے ہیں تو آپ کو داخلے کا حق ہے ورنہ تعلیم آپ کا بنیادی حق نہیں ہے۔ عدالتِ عالیہ کے اس فیصلے سے اعلیٰ تعلیم، منڈی کی معیشت کی تابع ہو گئی ہے۔ منڈی کی معیشت موجودہ حکومت کا منظور نظر فلسفہ ہے۔ یہی عالمی سرمایہ داری کا

محبوب نظریہ ہے۔ اسے ہی نو آزاد روی یا معاشی Neo-Liberalism کہا جاتا ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کا یہ جز و حکمراں استحصالی طبقات کے اسی فلسفے کا غماز ہے۔

اب آیئے اس فیصلے کے دوسرے جز و پر۔ اس کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں عدالتِ عالیہ نے ان اقلیتی تعلیمی اداروں کی مکمل خود مختاری کو تسلیم کیا ہے جو حکومت سے کسی طرح کی امداد نہیں لیتے۔ عدالت عالیہ کے فیصلہ کے مطابق ایسے تعلیمی اداروں کو نہ صرف نظم و نسق کے معاملے میں مکمل آزادی ہوگی بلکہ وہ داخلے اور فیس کے تعین کے معاملے میں بھی آزاد ہیں۔ یہ فیصلہ منڈی کی معیشت (Market Economy) کے اصول کے عین مطابق ہے۔ اگر آپ نے تعلیمی ادارہ اس وجہ سے قائم کیا ہے کہ اس سے آپ کو منافع ہو تو، پھر آپ کو داخلے کی شرائط کے تعین کا حق ہے۔ یہ ان اقلیتی تعلیمی اداروں کے لیے اشارہ ہے کہ اگر آپ داخلہ اور دیگر امور میں "آزادی" کے خواہش مند ہیں تو پھر حکومت کی امداد سے بھی "آزادی" حاصل کرلیں۔ آپ تعلیم کو اقلیتوں کی بہبود کے بجائے ایک تجارتی معاملہ بنادیں۔ دوسرے جزو کا دوسرا حصہ، ان اقلیتی تعلیمی اداروں کے بارے میں ہے جو حکومت سے امداد حاصل کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انھیں نظم و نسق کے معاملے میں آزادی ہوگی مگر اساتذہ کے تقرر اور ان کی شکایتوں کے بارے میں انھیں حکومت یا انتظامیہ کے طے کردہ اصولوں کی پاس داری کرنی ہوگی۔ اس حد تک فیصلے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

فیصلے کا دوسرا حصہ داخلے کے بارے میں ہے۔ یہاں عدالتِ عالیہ نے کہا ہے کہ اقلیتی تعلیمی اداروں کو ایک مقررہ تناسب میں غیر اقلیتی طلبہ کو داخلہ دینا ہوگا، اس کا جواز فراہم کرنے کے لیے عدالتِ عالیہ نے دستورِ ہند کی دفعہ (1)30 کو دفعہ 29 سے مشروط کردیا ہے۔ یہ گاڑی کو بیل کے آگے جوتنے کی کوشش ہے۔

عدالتِ عالیہ کے فیصلے کے مطابق اقلیتی تعلیمی ادارے اگر حکومت سے مالی مدد لیتے ہیں تو انھیں داخلے کے معاملے میں انتظامیہ کی مداخلت کو قبول کرنا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہو تو دستورِ ہند کی سیکولرزم اور مساوات کی روح مجروح ہوگی۔ عدالتِ عالیہ نے دلی کے سینٹ اسٹیفنس کالج کے ایک مقدمے میں غیر اقلیتی طلبہ کے داخلے کے تناسب کا تعین خود کیا تھا مگر تازہ فیصلہ میں اس کا حق ریاستی حکومت اور انتظامیہ کو دے دیا گیا ہے۔ عدالتِ عالیہ کا خیال ہے کہ یہ تناسب اس طرح طے کیا جائے کہ اکثریت میں امتیاز کا احساس نہ پیدا ہو۔

اس فیصلے کی سیاسی اصطلاح میں صراحت کی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سیکولرزم اور مساوات کی روح اس میں مضمر ہے کہ اکثریت امتیاز کے احساس سے جاگزیں نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں داخلے کی پالیسی سے یہ احساس نہ پیدا ہو کہ اقلیت کی 'خوشامد' یا 'چاپلوسی' کی جارہی ہے۔ اس لیے اقلیتی تعلیمی اداروں کی داخلہ پالیسی کو اس طرح مشروط کردیا جائے کہ اکثریت میں امتیازی سلوک کا احساس نہ پیدا ہو۔

عدالتِ عالیہ کے فیصلے کے پس پشت کارفرما فلسفہ موجودہ حکمرانوں کی اس پالیسی کا غماز ہے کہ اب تک اقلیتوں کی 'خوشامد' یا 'چاپلوسی' ہوتی رہی ہے۔ اب پالیسی کو اس طرح بدلا جائے کہ کسی کے بھی ساتھ امتیاز کا احساس نہ پیدا ہو۔ یہ سیکولرزم اور مساوات کے اصول کے ساتھ بھونڈا مذاق ہے۔ دستورِ ہند کی تدوین کرنے والوں کو احساس تھا کہ جمہوری معاشرے میں اس کی گنجائش ہے کہ اکثریت، اقلیت کے ساتھ ناانصافی کرسکتی ہے۔ اس لیے انھوں نے پہلے یہ فیصلہ صادر کیا کہ "شہریوں میں 'مذہب' نسل، زبان یا علاقے" کی بنا پر کوئی امتیاز نہ برتا جائے (دستورِ ہند کی دفعہ 29 کا یہی مقصد ہے)۔ یہاں واضح طور پر، مذہبی اور لسانی اقلیتوں کے خلاف امتیاز کی دارنگ موجود ہے۔

دستورِ ہند کی تدوین کرنے والوں کو احساس تھا کہ اس کے باوجود بھی امتیازی سلوک کا امکان ہے، اس لیے انھوں نے اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور ان کا انتظام کرنے کا حق دیا۔ (یہی دستورِ ہند کی دفعہ (1)30 کا مطلب ہے)۔

سپریم کورٹ نے اپنے حالیہ فیصلے میں اس ساری اسکیم کو ہی پلٹ دیا ہے۔ اس نے دستورِ ہند کی دفعہ (1)30 کو دفعہ 29 سے مشروط کیا ہے جو دستور سازوں کی منشا کی خلاف ورزی ہے۔

ویسے بھی یہ سیکولرزم اور مساوات کے اصول سے انحراف ہے۔ اقوام متحدہ کے منشور میں اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ اس کے منافی ہے۔

National Council for Promotion of Urdu Language ★ New Delhi ★
ACC No. 5170/15
15/10/08

وقار صدیقی

آبرو کے کلام میں گوالیاری [گوالیری] زبان کے اثرات

نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو کے کلام میں مختلف زبانوں اور بولیوں مثلاً پنجابی، دکنی، مغربی یوپی اور ہندی وغیرہ کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے لیکن اُس علاقے کی طرف کسی کی توجہ نہیں گئی جو آبرو کا مولد ہے اور جہاں کی زبان گوالیاری (گوالیری) کہلاتی تھی اور جو ہندستان بھر میں متعارف اور مستعمل تھی۔ خان آرزو نے اپنی لغت "نوادرالالفاظ" میں اُسے 'افصح السنہ ہند' کہا ہے۔ وجہی نے بھی "سب رس" میں گوالیار کی زبان کو مستند قرار دیا ہے۔

آبرو قیاساً 1096ھ مطابق 1683 میں گوالیار میں پیدا ہوئے وہ مشہور صوفی بزرگ شاہ محمد غوث گوالیاری کے پوتے تھے اور خان آرزو کے رشتے دار اور شاگرد۔ تلاشِ معاش کی غرض سے آرزو ہی کی طرح آبرو بھی دہلی منتقل ہو گئے تھے، لیکن دہلی میں جابسنے کے باوجود آبرو کے کلام میں اس علاقے کی بولی بندیلی کے اثرات ملتے ہیں۔ اس مختصر سے مضمون میں انھی اثرات کو اُن کے دیوان کی پہلی دس غزلوں میں تلاش کیا گیا ہے۔ ہمارے پیشِ نظر ڈاکٹر محمد حسن کا مرتبہ "دیوانِ آبرو" ہے جو مخطوطہ پٹیالہ پر مبنی ہے۔ ہم اس کی بنیاد پر ہی گفتگو کریں گے۔

ردیف الف کی پہلی غزل کا مطلع ملاحظہ کیجیے:

آیا ہے صبح نیند سوں اُٹھ، رسمسا ہوا
جامہ گلے میں رات کا، پھولوں بسا ہوا

پہلے مصرعے میں 'سے' کے بجائے 'سوں' کا استعمال اس علاقے کے اثر کو ظاہر کرتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں 'پھولوں بسا ہوا جامہ' بندیلی کے اندازِ بیان کا اثر ہے۔

اسی غزل کا دوسرا شعر ہے۔

کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگ زرد
سونا وہی جو ہووے کسوٹی کسا ہوا

اس شعر میں 'کسوٹی کسا ہوا' میں بھی اندازِ بیان کا وہی رنگ ہے جو بندیلی کی طرف ذہن کو منتقل کرتا ہے۔

آبرو کے کلام میں بعض الفاظ میں 'نون' کا اضافہ ملتا ہے، مثلاً 'سے' کے بجائے 'سیں'، 'کو' کے بجائے 'کوں'، 'نے' کے بجائے 'نیں' جگہ جگہ ہے، جو بندیلی کی خصوصیت ہے۔ پہلی غزل میں 'سیں' چھ بار استعمال ہوا ہے۔

اسی غزل کا ایک اور شعر دیکھیے۔

قامت کا سب جگت منیں بالا ہوا ہے نام
قد اس قدر بلند تمھارا رسا ہوا

مصرعے میں 'میں' کی جگہ 'منیں' کا استعمال اس علاقے کی یاد دلاتا ہے۔

زاہد کے قدِ خم کوں مصوّر نیں جب لکھا
تب کلک ہاتھ بیچ جو تھا سو عصا ہوا

اس شعر میں 'کو' کے بجائے 'کوں'، 'نے' کے بجائے 'نیں' کے استعمال میں بندیلی کی وہی خصوصیت نظر آرہی ہے جس کا ذکر ڈاکٹر سیتا کشور نے اپنے پی ایچ. ڈی کے مقالے (Pronoun, Adverb and Preposition) میں کیا ہے اور صفحہ 137 پر مثالیں پیش کی ہیں:

رکھا تیں، جسیا سیں، بھینسا کوں چار دکانو

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آبرو کے یہاں 'ن' کا یہ اضافہ علاقائی اثر ہے، دکنی کا نہیں۔ اُن کا بچپن گوالیار میں گزرا اور یہاں کی گلیوں میں کھیلتے ہوئے ہی اس اثر کو انھوں نے قبول کیا جس کا اظہار اُن کے اشعار میں جگہ جگہ پایا جاتا ہے۔ اگر ہم مذکورہ بالا دیوان کی پہلی دس غزلوں میں 'ن' کے اضافے کو دیکھیں تو ان دس غزلوں کے کل 63 اشعار میں 'سیں' 28 بار، 'کوں' 14 بار اور 'نیں' سات بار استعمال ہوا ہے۔ جبکہ ان دس غزلوں میں ایک غزل میں صرف چار اور ایک میں صرف دو اشعار ہی دیوان میں درج ہیں۔

چوتھی غزل کا مطلع ہے:

چہرے نیں سرخ تیرے سارے جگت کو موہا
اے لال سر پہ تیرے یہ آج خوب سوہا

اس میں چہرے کی 'ہ'، 'یے' میں تبدیل ہو گئی ہے جو بندیلی کی خاصیت ہے: مثلاً یہاں محنت کو 'مینت' کہا جاتا ہے۔ شعر کے مصرعہ ثانی میں 'سوہا' یعنی اچھا لگا بھی مقامی بولی کے اثر کو ظاہر کرتا ہے۔ 'سارے جگت کو موہا' بھی ہندی اور بندیلی اثر کا نتیجہ ہے۔

جب سیں مروڑ کھائی بل تب سیں پھر نہ نکلا
تیغ بھواں کو تیری تھا کس طرح کا لوہا

اس شعر میں مروڑ کھانا یعنی اینٹھنا بندیلی کا اثر ہے۔ اس شعر میں 'تیغ' کے سوا تمام الفاظ مقامی رنگ کے حامل ہیں۔

سینے سیں آبرو کے ہر دم کے ساتھ آنجھو
نکلا ہے یوں کوئے سیں جو نکر بھرا بروہا

کنویں کے بجائے 'کوئے' یہاں کی بولی کے مطابق ہے۔ 'بُروہا' ایک قسم کا گھڑا ہوتا ہے جس میں پانی بھر کر پان کی کھیتی کی سینچائی کی جاتی ہے اور پان کے پودے جو قطاروں میں لگائے جاتے ہیں، ان قطاروں کو بھی بروے کہا جاتا ہے۔ اس علاقے میں پان کی کھیتی اور پان کاروبار کرنے والے لوگ برئی کہلاتے ہیں۔ غالباً اسی رعایت سے یہاں ایک گاؤں کا نام بھی برئی ہے، جو آج بھی پان کی کھیتی کے لیے مشہور ہے۔ 'بروہا' اس علاقے کی بولی کا ہی لفظ ہے۔
چھٹی غزل کا مطلع ہے:

نہ چھوڑے گا پیارے جی کسی کا
تمھارا حسن کے یہ کہنا اجی کا

'کیا' کے لیے 'کا' کا استعمال بھی علاقائی چلن ہے اور اجی بھی مخاطب کرنے کے لیے یہاں بولا جاتا ہے۔ اسی غزل میں وس، ناگنی، بان بَرن، کنچنی، ہندی الفاظ مختلف اشعار میں نظم ہوئے ہیں۔ اس کا سبب اس علاقے کا ہندی کا مرکز ہونا بھی ہے۔

سخن کے سروراں ہیں آبرو آج
نہیں شیریں زباں شاکر سری کا

'سری کا' یعنی 'کی طرح' یا 'جیسا'۔ یہ اس علاقے میں عام بول چال میں بے تکلف استعمال ہوتا ہے۔

ساتویں غزل میں 'جس'، 'تس' کا استعمال ہوا ہے۔ یہ استعمال بھی یہاں عام ہے۔ اب اسی غزل کا یہ شعر دیکھیے:

برہ کی راہ میں جو بھی گرا سو پھر نہ اٹھا
قدم پھرا نہیں یاں آکے دستگیروں کا

اس شعر میں 'برہ' بہ معنی جدائی تصوف کی ایک خاص کیفیت ہے۔ اس لفظ کے بجائے دوسرا کوئی لفظ اس کیفیت کے اظہار کے لیے مناسب نہیں۔ آبرو جو خود شاہ محمد غوث گوالیاری کے صوفی خاندان کے فرد تھے، اس لفظ کا استعمال فنکاری سے کرتے ہیں۔

غزل 8 میں یہ شعر ہے:

وہ گل رو، ماہ کی جیوں جب کبھی اِس راہ ہو نکلے
دکھا کر جوت اپنی بیچ دل میں مہر کا بوجا

اس شعر میں بھی ہندی کا لفظ 'جوت' استعمال کیا گیا ہے جو تصوف کی روایت کو ہندستانی طرز میں ڈھالنے کی کوشش ہے۔

نویں غزل کے قافیے مٹکنا، لٹکنا، اٹکنا، پھٹکنا، چٹکنا، جھٹکنا، ٹھٹھکنا، ایسے لفظ ہیں جو یہاں بہ کثرت استعمال ہوتے ہیں۔ 'چٹکنا' پرندوں کو اڑانے کے لیے استعمال ہونے والی، سُتلی سے بنی ہوئی ایک چیز ہے جس سے 'چٹاخ' کی آواز ہونے کی وجہ سے اُس کا نام 'چٹکنا' پڑ گیا ہے۔

اسی طرح دسویں غزل کے قافیے لالا، بھالا، ہالا، گالا، نرالا، مالا، چھنالا بھی ان کے علاقائی استعمال کے اثر کو ظاہر کرتے ہیں۔

ایک مصرعہ ہے: "لاگا ہے اس کے دل میں دیکھا ہے جن نیں بھالا"
یہاں 'جن نیں'، 'جنھوں نے' کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یہ ٹھیٹ بندیلی اثر ہے۔ انھوں نے یہاں کی مقامی زبان کو اپنی شاعری میں خوب استعمال کیا۔ بندیلی کو کچھ لوگ برج بھاشا کا نام دیتے رہے ہیں جبکہ وہ اصل میں 'مدھیہ دیشیہ' زبان ہے، یہ برج بھاشا کے نزدیک ضرور ہے لیکن یہ برج بھاشا نہیں ہے۔ اس میں رفتہ رفتہ عربی، فارسی اور کھڑی بولی کے اثرات بڑھتے گئے اور اس علاقے کی ادبی زبان کو گوالیری (گوالیاری) کہا جانے لگا۔ آبرو کے کلام کی اس لسانی خصوصیت کی طرف اب تک کسی نے اپنی توجہ مبذول نہیں کی ہے۔ اس علاقے میں ساری عمر گزارنے کی وجہ سے جب جب میری نظر سے آبرو کا کلام گزرا تو مجھے لگا کہ ان کے یہاں، یہاں کی علاقائی زبان دور تک گھر کیے ہوئے ہے۔

□□□

Gadve-Ki-goth, Hakim Sahab Ka Bada,
Lashkar, Gwalior -474001 (M.P.)

قومی اردو کونسل نے نہ صرف حوالہ جاتی بلکہ اعلیٰ درجات کی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں شائع کی ہیں۔

طلبہ کے لیے خصوصی رعایت

پتا: قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی-110066

کلیم اللہ

قومی اردو کونسل کی طرف سے ادبِ اطفال کی پیشکش

بچے نہ صرف اپنے والدین کے بڑھاپے کی لاٹھی ہوتے ہیں بلکہ ملک و قوم کے مستقبل کے امین بھی ہوتے ہیں۔ دنیا کا ہر انسان خواہ وہ مرد ہو یا عورت، عہدِ طفلی سے گزر کر ہی میدانِ عمل میں قدم رکھتا ہے۔ لہٰذا عہدِ طفلی کی سنہری یادوں کا تجربہ ہر ایک کو ہوتا ہے جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتا رہتا ہے اور حساس ذہن اسے ضبطِ تحریر میں بھی لے آتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں ہندستان کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا نام محتاجِ تعارف نہیں جن کے یومِ ولادت 14/ نومبر کو ہر برس یومِ اطفال کے طور پر منایا جاتا ہے۔ انھوں نے اس بات پر ہمیشہ زور دیا کہ ہماری آنکھیں دنیا کی خوبصورتی کو دیکھنے، کان اس کے آہنگ کو سننے اور دماغ زندگی کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے ہونا چاہیے۔ دنیا کے کچھ لوگ، جنھیں بڑا تصور کیا جاتا ہے، وہ فطری سماج کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے "اپنے لیے مذہب، ذات، رنگ، پارٹی، قوم، ریاست، زبان، رسم و رواج اور امیری و غریبی کی دیوار کھڑی کر لیتے ہیں۔ اس طرح وہ خود اپنے بنائے ہوئے قید خانوں میں رہتے ہیں لیکن خوش قسمتی سے بچے ان سب چیزوں کے متعلق زیادہ نہیں جانتے ہیں جو ایک دوسرے کو الگ کرتی ہیں۔" (جواہر لال نہرو کا خط ہندستانی بچوں کے نام۔ 3 دسمبر 1949، بحوالہ ٹائمس آف انڈیا۔ 14 نومبر 2002)

بچوں کی ان نہج پر پرورش و پرداخت کرنا جو مذہب، ذات، رنگ، نسل، قوم، ریاست، زبان، رسم و رواج کی قیود سے آزاد ہو، ہر ملک و قوم کی بنیادی ذمے داری ہے۔ جب بچوں کی تعلیم و تربیت ان خطوط کے برعکس ہوتی ہے تو وہی بچے جو ملک و قوم کے امین کہلاتے ہیں، خائن بن جاتے ہیں اور ملک کو جوڑنے کے بجائے توڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ بچے کی تعلیم کا سلسلہ صحیح نہج پر اسی روز سے شروع کر دیا جائے جس دن وہ دنیا میں قدم رکھتا ہے۔

عام طور پر تعلیم و تربیت کو مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے جو حقیقتاً درست نہیں ہے۔ یہ دونوں الفاظ ہم معنی نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جو تعلیم یافتہ ہیں وہ تربیت یافتہ بھی ہوں گے اور جو تربیت یافتہ ہیں وہ زیورِ تعلیم سے آراستہ بھی ہوں گے۔ سر سید احمد خاں کے لفظوں میں "تعلیم و تربیت کو ہم معنی سمجھنا بڑی غلطی ہے بلکہ وہ جدا جدا دو چیزیں ہیں۔ جو کچھ اس میں ہے، اس کو باہر نکالنا، انسان کو تعلیم دینا ہے اور اس کو کسی کام کے لائق کرنا، اس کی تربیت کرنا ہے"۔ (بحوالہ انتخاب مضامین سر سید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، تعارف۔ پروفیسر آل احمد سرور، سنہ اشاعت۔ 1996، صفحہ 54)

گویا قدرت نے بچے کو جن صفات سے متصف کیا ہے، ان کو متحرک کرنا تعلیم کا فریضہ ہے اور ان صفات کو اُجاگر کرنے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہو، ان کو مہیا کروانا، تربیت ہے۔ بچے کو مکمل انسان بنانے اور اس کو صراطِ مستقیم پر چلانے کے لیے دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔

بچے کی کل کائنات اس کا مہد، اس کے والدین، اس کے خاندان کے دیگر افراد اور اس کے پاس پڑوس کے لوگ ہی تو نہیں ہیں بلکہ جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہے اس کی کائنات وسیع سے وسیع تر ہوتی جاتی ہے۔ جب بچہ ایک خاص عمر کی حد کو پار کر جاتا ہے تو اس کی تعلیم و تربیت کی ذمے داری والدین کے ساتھ ساتھ ملک و قوم پر بھی عائد ہو جاتی ہے۔ آئینِ ہند 14 سال کی عمر تک بچے کی مفت اور لازمی تعلیم کی سفارش کرتا ہے جس کا اطلاق ابھی تک ریاستی اور مرکزی سطح پر کلی طور پر نہیں ہو پا رہا تھا۔

قومی تعلیمی مشن کے اس 'لکشیہ' کو حاصل کرنے کے لیے آئینِ ہند میں 93ویں ترمیم کر کے حکومتِ ہند نے 6 سے 14 برس کی درمیانی عمر کے بچوں کی تعلیم کو بنیادی حقوق میں شامل کر دیا ہے۔ جس کے تحت عمر کے اس زمرے میں آنے والے بچوں کی دیکھ ریکھ اور تعلیم کا انتظام حکومتِ ہند از خود کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس بل کے نفاذ پر حزبِ مخالف کی رہنما سونیا گاندھی کے مطابق -/9800 کروڑ روپے کا سالانہ صرفہ آئے گا۔ (بحوالہ انڈین ایکسپریس۔ 28 نومبر 2001)۔ انڈین ایکسپریس کی اسی رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس عمر کے زمرے میں آنے والے بچوں کی تعداد 15 کروڑ سے زیادہ تھی جن میں 36 فیصد غریبی کی سطح سے نیچے تھے۔

موجودہ دور میں چلڈرن بک ٹرسٹ کی ان کوششوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو انھوں نے بچوں کی ہمہ جہت ذہنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کی ہیں۔ اس تنظیم کا قیام 7 مئی 1957ء کو عمل میں آیا۔ تب سے لے کر آج تک یعنی 46 برسوں میں یہ تنظیم انھی خطوط پر کام کر رہی ہے جن کا اعلان اس نے اپنے قیام کے وقت کیا تھا۔ اس کے مقاصد میں:

"ادب، آرٹ، تاریخ، جغرافیہ، بنیادی سائنس اور اس قسم کے

دوسرے مفید علوم کے تعلق سے، جیسا کہ اس ٹرسٹ کے ذریعے وقت بہ وقت متعین کیا جائے گا، بچوں میں علم کے diffusion کے ذریعے تعلیم کے پھیلاؤ میں مدد کرنا اور کیفیتی طور پر اصلاح، ترقی اور معاونت کرنا شامل ہے"

(Memorandum of Association, Children Book Trust, New Delhi - Page 1)

اگر آپ اس ٹرسٹ کے منشور کو بغور دیکھیں تو پائیں گے کہ اس میں جواہر لال نہرو کے ان خیالوں کی روح کو سمونے کی کوشش کی گئی ہے جو وہ اس خوبصورت دنیا کے پودوں، درختوں، چرندوں، پرندوں، جانوروں، ستاروں، پہاڑوں، برفیلے تودوں اور دوسری خوبصورت چیزوں کے بارے میں جو ہمارے چاروں طرف موجود ہیں، بچوں سے share کرنا چاہتے تھے، اور شاید بچوں میں ٹرسٹ کی کتابوں کی مقبولیت کی دوسری وجوہ کے علاوہ ایک بنیادی وجہ ان کتابوں میں کائنات کے آفاقی نظریات کی موجودگی بھی ہے۔

اردو داں طبقے کی تساہلی کہیے کہ وہ اس نوع کے ادب سے اردو زبان کو مالا مال نہ کر سکے جو بچوں کی نفسیات، دلچسپیوں، رجحانات اور انفرادی اختلافات کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا گیا ہو۔ یوں تو اردو میں ادب اطفال کی روایت امیر خسرو، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی۔۔۔۔۔۔ سے لے کر شفیع الدین نیر محوی صدیقی، کیف احمد صدیقی، عبدالواحد سندھی، عبدالغفار مدھولی اور ایم یوسف انصاری تک ملتی ہے۔ لیکن ان میں سے چند کو چھوڑ کر زیادہ تر کی تخلیقی پرواز قدیم قصوں اور کہانیوں تک ہی محدود ہے سائنس کی نت نئی ایجادات اور جدید ٹکنالوجی کے حیرت خیز کرشموں تک ان کی نظر کم کم گئی ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ اور پبلی کیشن ڈویژن نے اس جانب کچھ اقدامات کیے ہیں اور بچوں کے لیے اردو زبان میں معلوماتی کتابیں شائع کی ہیں لیکن یہ کوششیں بھی تشفی بخش نہیں ہیں۔ اردو میں ادب اطفال کی اس کمی کو اردو والوں نے گذشتہ صدی کے آخری دو دہوں میں شدت سے محسوس کرنا شروع کیا اور انھیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر اردو میں بچوں کے لیے اچھا ادب پیدا نہیں کیا گیا تو ان کی مادری زبان اردو ان کے بچوں کی ذہنی ضرورتوں کا ساتھ نہ دے سکے گی کیونکہ آج کا بچہ زمانے سے ہم آہنگ رہنے اور اس کے شانہ بشانہ چلنے کا خواہش مند ہے۔

اردو میں قومی معیار کے ادب اطفال کی فراہمی کی غرض سے قومی اردو کونسل نے "بچوں کا ادبی ٹرسٹ" کی اس پیش کش کو بخوشی منظور کر لیا جس کے تحت چلڈرن بک ٹرسٹ کی مختلف علوم پر مبنی 470 کتابوں کو اردو کا جامہ پہنایا جاتا ہے جو درجہ ایک سے درجہ 12 تک کے بچوں کے معیار کے مطابق ہیں۔ فی الحال 125 کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کو منظر عام پر لانے میں قومی اردو کونسل کو چلڈرن بک ٹرسٹ کا تعاون بھی حاصل رہا ہے۔ اس سہ فریقی پروجیکٹ کے تحت اب تک 102 کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کا معیار پیشکش وہی ہے جو چلڈرن بک ٹرسٹ کا ہے کیوں کہ قومی اردو کونسل نے ان کتابوں کی اشاعت ٹرسٹ کے ذریعے ہی کروائی ہے۔ مذکورہ شائع شدہ 102 کتابوں کے علاوہ، 23 کتابیں زیر اشاعت ہیں۔ قومی اردو کونسل نے ان کتابوں کے انتخاب سے لے کر طباعت کے مرحلے تک -/51,16,961 روپے خرچ کیے ہیں۔ اس طرح قومی اردو کونسل نے اردو میں معیاری ادب اطفال کی کمی کا ازالہ اس پروجیکٹ کے توسط سے کیا ہے جس کے تحت شائع کی گئی کتابوں کی اردو حلقوں میں بے حد پذیرائی ہو رہی ہے۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

محکمہ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 006 110

حیات جاوید

الطاف حسین حالی

سر سید احمد خاں کے رفیق کار مولانا الطاف حسین حالی کے قلم سے سر سید احمد خاں کی زندگی کے حالات اور ان کی قومی اور مذہبی خدمات کا بیان ---

چوتھا ایڈیشن

صفحات: 907، قیمت: 167

اردو ادب کی تنقیدی تاریخ

سید احتشام حسین

اردو ادب کی تمام اصناف کا مختصر مگر جامع تعارف، تاریخی حوالوں کے ساتھ طلبہ کے لیے بہ طور خاص کار آمد ---

چوتھا ایڈیشن

صفحات: 334، قیمت: 70.00

شعریات

ارسطو کی بوطیقا کا ترجمہ اور تعارف

شمس الرحمٰن فاروقی کے قلم سے

ہر ادبی لائبریری میں اس کتاب کی موجودگی ضروری ہے

تیسرا ایڈیشن مع اضافۂ جدیدہ

صفحات: 136، قیمت: 62.00

رتن ناتھ سرشار

("فسانۂ آزاد" جلد اوّل سے اقتباس)

بڑے بڑے کھیل اور بڑے بڑے تماشے

آؤ کھلاڑی آؤ! پریوں کے پون دیکھ جاؤ بمبئی کے پارسی لکھنؤ چھتر (1) منزل میں، اندر سبھا کا وہ تماشا دکھاتے ہیں، کہ اس فن کے مبصر تک وجد میں آتے ہیں۔ وہ پیاری پیاری صورتیں، مٹی کی مورتیں دکھائیں، کہ ناظرین دنگ ہو جائیں۔ درجہ بندی تو ضرور ہے۔ پھر جیسا گڑ ڈالو گے ویسا مزہ پاؤ گے۔ مگر دیکھیں گے سب از برائے خدا آؤ آؤ اور ضرور آؤ، ورنہ پچھتاؤ گے۔

آزاد تو سیر سپاٹے پر ادھار کھائے ہی ہوئے تھے، جھٹ سانڈنی کو لکھنؤ کے رخ سبک پو یہ کیا، جہاں تماشا ہونے کو تھا۔ سانڈنی بلا کی باد رفتار، آہو شکار، دغا پسند و سر بلند۔ گردن اٹھائے، دم دبائے، بلبلاتی، اور شتر غمزے دکھاتی، شہ گام جانے لگی۔ اور دن سے لکھنؤ کے پکے پل پر کچی دو گھڑی میں داخل۔ میاں آزاد کا دماغ فلک الافلاک پر کہ میری اونٹنی کی کچھ نہ پوچھو۔ یہ بے پر کی پریوں کو مات کرتی ہے۔ وہاں سے ایک طرارہ بھرا، تو چھتر منزل میں کھٹ سے آن موجود۔ اہو ہو ہو! کیا مقام مینو سواد ہے۔ الٰہی یہ زمین ہے یا بہشتِ شداد ہے۔ یہ رنگین دروازے ہیں، یا بابِ گلستان۔ یا ابوابِ جناں۔ اہاہا، آج جمعرات ہے۔ مشتری کی کرامات ہے۔ روز آدینہ، پر اس کو تقدم بالزماں ہے۔ سعد اکبر مشہور جہاں ہے۔ لیلائے شب کاملِ پریشان، نو عروسانِ چمن مست و غزلخواں۔ اُدھر چشمہ سار کی روانی۔ ادھر بحرِ طرب کی طغیانی۔ تماشائی جوق جوق ڈٹ رہے تھے۔ ٹکٹ کھٹا کھٹ بٹ رہے تھے اتنے میں گھنٹی بجی، اور محفل دلہن کی طرح سجی۔ سامنے پردۂ زنگار، اور اس پر کہسار، اور دامنِ کوہ میں سبزہ زار، اِدھر اُدھر اشجار پر بہار، عقل دنگ ہے کہ الٰہی یہ پردہ ہے یا نگار خانۂ ارژنگ ہے۔ وہ گل بوٹے کہ واہ جی واہ۔ وہ نقش و نگار کہ سبحان اللہ۔ تماشائی پرانے رسیا تاڑ گئے کہ ع۔ "کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں" اتنے میں پردہ اٹھا۔ تو آنکھ جھپک گئی۔ وہ چکا چوند کا عالم کہ نظر کا پاؤں پھسلا جاتا تھا۔ راجہ اندر تخت جواہر نگار پر بڑی شان اور بان سے متمکن ہیں۔ تخت فیروز بخت کو دیکھ کر حیرت تھی کہ بالعجب! یہ جواہر ثمین کی دکان ہے، یا تختِ رواں ہے۔ تاج مکلل کے گوہر شاہوار، افشاں جبیں، خوباں یغمانی، اور عکس یواقیتِ آبدار، نور مہر دلربائی، برنائی، اور خود نمائی، چہرے سے عیاں، شانِ کشور کشائی بشرے سے نمایاں:

بالائے سرش زہوش مندی

می تافت ستارۂ بلندی

پھر تو ہر در و دیوار سے چھُن چھُن، چھم چھم، کی آواز آنے لگی اور محفل بھر کھل کھلانے لگی۔ ایک لولی غلمان نظیر نے عجب ادائے دلپذیر سے چمک چمک کر گانا شروع کیا، اور دائرہ والے نے گت بجانا شروع کیا:

سبھا میں دوستو اندر کی آمد آمد ہے

پری جمالوں کے افسر کی آمد آمد ہے

اوں، اوں، ایں! یہ کیا؟ جی کالے دیو کی آمد ہے۔

ماشاءاللہ! انوکھی قطع، اور نرالی وضع، کے علاوہ خوش گلو بھی کتنے بڑے ہیں۔ اس گلے پر ٹڈیاں اور چوہے نثار۔ یہ ٹڈیوں اور چوہوں کی خصوصیت کیا تھی۔ کتے کیوں نہ صدقے کر دیے۔ واہ واہ ٹڈیاں اور چوہے تو کھیت کے کھیت ستیاناس کر جاتے ہیں، اور کتے رات بھر چوکی پہرہ دیا کرتے ہیں۔ انھوں نے آتے ہی وہ دواند مچائی کہ ساری محفل لوٹ گئی۔ ماشاءاللہ خوش لقا ہی نہیں خوش ادا بھی ہیں۔ اللّٰہم زد فزد۔ راجہ اندر نے حکم دیا کہ میری پریوں کو بلاؤ، اور کہو اپنا اپنا جوہر دکھاؤ۔ پردہ پڑ گیا۔ اب تماشائی نرگس کی طرح دیدۂ حیراں ہیں، کہ کہیں پردہ اٹھے۔ زبانِ حال سے پکار رہے ہیں کہ:

کیسا حجاب کس کی حیا، اور کہاں کی شرم

پردے سے ہاتھ، ہاتھ سے پردہ اٹھائیے

اتنے میں:

پل مارنے کی ہوئی جو دیری

سبحان اللہ شان تیری

یہ پردہ ہلا۔ وہ اٹھا۔ جل جلالہ۔ عم نوالہ۔ اہو ہو ہو! کیا پیاری پیاری صورت نظر آئی ہے۔ کیا شانِ کبریائی ہے۔ چھم چھم، چھم چھم ہوہ برق دم ہوہ خم وچم، کہ زہاد صد سالہ بھی آیۂ فتبارک اللہ احسن الخالقین پڑھیں۔ کیوں نہیں قدرتِ حق کا نمونہ ہے میاباتیں۔ استعجاب تھا کہ یہ باد بہاری ہے۔ یا نکھراج پری کی سواری ہے۔ یہ انسان ہے یا سچ مچ کی پری، آدم زاد اور پھر شانِ دلبری:

● فسانۂ آزاد کلاسیکی اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ فنی اعتبار سے یہ داستان اور ناول کے درمیان کی صنف ہے۔ فسانۂ آزاد نہ صرف زبان و بیان اور معاشرے کی عکاسی کی وجہ سے بلکہ اپنے دلچسپ کرداروں کے اعتبار سے بھی پرکشش ہے۔ فسانۂ آزاد کا دوسرا ایڈیشن زیرِ طبع ہے۔

اس طراقے سے تھی وہ مہ پارہ
کہ پھسلتا تھا پائے نظارہ
روے تاباں چراغ گلشن نور
صبح رُخسار روکش رخ حور
محفل راجہ میں پکھراج پری آتی ہے
سارے معشوقوں کی سر تاج پری آتی ہے
چھم چھم، چھم چھم، یہاں گت چلی جائے گت۔

پھر پردہ پڑ گیا۔ دیکھیں اب کی کس کا جھمکڑا نظر آتا ہے۔ کس برق وش، شعلہ رو، کا حسنِ گلوسوز، خرمنِ دل کو جلاتا ہے۔ کھٹ سے حجاب مرتفع ہوا۔ چھما چھم کرتی ہوئی نیلم پری آئی۔ اس مصور کے صدقے جس نے یہ نورانی صورت بنائی:

سبھا میں آمدِ نیلم پری ہے
سراسر وہ نزاکت سے بھری ہے
نہ دیکھا ہوگا ناچ ایسا کسی نے
بلا ہے سحر ہے جادو گری ہے

پھر پردہ پڑا، اور دَم میں غائب، یا مظہر العجائب! لال پری چمکتی ہے، اور سرخا سرخ پوشاک کسی ہے۔

سبھا میں لال پری کی سواری آتی ہے
جمانے رنگ اب اندر کی پیاری آتی ہے

پھر وہ پردہ پڑ گیا۔ اب کی تو کچھ ٹھاٹھ ہی نرالے ہیں۔ پردہ بھی فرطِ مستی سے جھوم رہا ہے اور اندر کے اکھاڑے کو بار بار چوم رہا ہے الٰہی! یہ کس مستِ صہبائے ناز، بتِ طناز کی آمد آمد ہے۔ ع۔ کہ شاخیں جھومتی ہیں نالۂ بلبل ہے مستانہ "خدا ہی خیر کرے۔ اب کی تو قہر کا سامنا ہے۔ ابھی سے دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس پردۂ زنگار میں کوئی ترکِ زرّیں کمر ستم گر ضروری:

ہر دم دل نواز بہا کہ می آید کہ در گوشم
صدای آمد آمدی پرواز دل طپید نہا

وہ پردہ اٹھا اور نور کا بکا نظر آیا۔ جیسے دامنی دمکے، یا بجلی چمکے۔ الٰہی! یہ نور کی سواری ہے، یا خاتونِ حسن کا ہنڈولا ہے۔ نہیں نہیں، میاں یہ سبز پری کا اڑن کھٹولا ہے۔ جل جلالہٗ، جل جلالہٗ، الٰہی یہ طوطی زمردیں پر و بال ہے، یا طاؤسِ رنگیں خط و خال ہے۔ یا بتِ جادو جمال ہے۔ قیامت کی چھب قہر کی چال ڈھال ہے۔ انکھڑیاں لگاوٹ باز، سر مستِ خوبی و محوِ ناز، گورا گورا مکھڑا، چاند کا ٹکڑا، غالیہ مو، قوس ابرو، نازک خرام، گلفام، وہ سبک روی رفتار، کہ نسیم فردوسی اس پر نثار، خرامِ ناز، موجِ تسلیم بہار۔ ابرو بسم اللہ سورۂ نور، یا پیش طاق منظر سرور۔ زلفِ سیاہ کے قریب کانوں میں درِ خوش آب، جیسے اندھیری رات میں کرمکِ شب تاب۔ وہ جڑاؤ پازیب، ملائک نظر فریب:

خشمگیں برق خرمنِ دل و جان
چتون رہزنِ متاعِ تواں
غیرتِ چشمۂ حیات دہن
روزنِ کوزۂ نبات دہن
سرو جس پر فدا، وہ قامت ہے
ناز پروردۂ قیامت ہے
نشہ بادۂ شباب میں چور
چال مستانہ حُسن پر مغرور
شورِ خلخال برقِ خرمنِ ہوش
عکسِ نور عِذار جلوہ فروش

پھر تو سبز پر جو نظر پڑی، تو بے اختیار محفل کی محفل زبانِ حال سے کہنے لگی کہ:

خوش وسمہ کشیدی خم ابروئے دو تارا
کردی چہ سیہ تاب دمِ تیغ قضارا

جب اس ٹھسّے سے سبز پری آئی اور سوہنی کی دُھن میں امانت کی غزل گائی تو در و دیوار نے یہ صدا سنائی:

تو بدیں جمال و خوبی سوئے طور گر خرامی
اَرِنی بگوید آں کس کہ بگفت لن ترانی

لب سرخ پوشاک ہری۔ بقول استاد۔ "چہرے میں زمرد سے سوا جلوہ گری" فیروزے سے خوش رنگ، اور کھری۔ آب گوہر سے منھ دھوئے ہوئے، بال بال موتی پروئے ہوئے۔ وہ چمک دمک کہ الاماں! وہ شوخی کہ الحفیظ! وہ قہر آلود نظر غلط انداز کہ الحذر! محفل کا رنگ ایسا جما، اور وہ سماں بندھا، کہ واہ جی واہ۔ وہ نازک آوازی، وہ لحن داؤدی، وہ صورتِ باربدی کہ اہو ہو ہو۔ ذرا مسکرا دیا تو عجمی بول اٹھے، کہ بابا ایں تبسم نازست۔ نظامی گنجوی نے تربت سے آواز دی کہ "دکانِ شکر فروش بازست" ناچنا شروع کیا تو دلِ عشاق پامال ہو گیا۔ شجرِ عاشقی نہال ہو گیا:

زرقصِ سبزہ پوشی مردہ زیرِ خاک می رقصد
تو گوئی در لباسِ خضر پیدا شد مسیحائی

زہے زمزمۂ جاں فزا، نغمۂ روح افزا۔

الغرض سبز پری کا شہزادۂ گلفام کو خواب ناز میں دیکھنا، اور شمع رخسار شہزادۂ شعلہ رو سے، آنکھیں سینکنا، انگوٹھی کا بدلنا، اور فرطِ عشق سے مچلنا،

کالے دیو کو اس کی تلاش میں بھیجنا، اور شہزادے کا مع پلنگ آنا۔ اور سبز پری کا شانہ پکڑ کر ہلانا، اور خواب سے جگانا، اور شہزادے کا بیدار ہو کر نظرِ حیرت سے چو طرفہ دیکھنا، سبز پری کا اصرار، شہزادے کا انکار، پھر سبز پری کے ساتھ اندر کے اکھاڑے میں جانا، اور لطف اڑانا، اس خوبی و خوش اسلوبی سے ادا کیا، کہ ہر سمت شورِ تحسین بلند تھا۔ ہر تماشائی خرم و خرسند تھا۔ سبز پری نے راجہ اندر کی سبھا میں پرچ کی دھن میں "موری انکھیا پھڑکن لاگیں رے" اس ٹھمری کو گایا اور راجہ کو لبھایا۔ اتنے میں لال دیو چغل خور نے چغلی کھائی، اور گلفام کی شامت آئی اور سزا پائی۔ سبز پری بادۂ مطرود، و سینہ مجروح، جوگن بن کے "شہزادے کو ڈھونڈھن چلیں" ہاتھ میں سمرن دبائے، منھ پر بھبھوت رمائے، سر پر انڈوا جمائے، گردن میں سیلیاں پڑی ہوئی، در و دیوار سے آنکھیں لڑی ہوئیں۔ لٹ چھٹکا کر، بھیس بنا کر، "شہزادے کو ڈھونڈھن چلیاں۔" اُف ری لگاوٹ، او رواہ ری بناوٹ، نقل کو اصل کر دکھایا۔ محفل بھر کو زار زار رلایا۔ اس جوگن پر اور ہی عالم تھا۔ شدہ شدہ راجہ اندر کو خبر ہوئی کہ ایک جوگن بن بن متوالے کی طرح گھوم رہی ہے۔ انھوں نے طلب کیا، اور محظوظ ہو کر پان دیا۔ گلفام اور سبز پری کا وصل ہوتا یہ سماں قابلِ دید، بلکہ دیدنہ شنید ہے۔ اور جس وقت سب پریاں مل کر مبارک باد گائیں، اس وقت تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ راگ اور راگنی ہاتھ باندھے سامنے کھڑی ہے۔ پریوں کی چمک، اور پاؤں کی ٹھمک، اور پازیب کی چھمک، اور نیلی ہری لال پوشاک کی جھلک، اور طبلے کی گمک، ستم ڈھاتی تھی۔ ہر سمت سے صدائے احسنت آتی تھی۔

الغرض چہل بل، ناچنے گانے، تحرک کرتانے میں سب پریاں بلائے جان تھیں۔ مگر سبز پری سارے معشوقوں کی سرتاج تھی۔

فنکشنل عربی میں قومی اردو کونسل کا دو سالہ فاصلاتی ڈپلومہ

(اللغة العربية الوظيفية)

رجسٹریشن 31 مارچ 2003 تک

اہلیت : عربی کی ابتدائی تعلیم مع قواعد۔ اس کے علاوہ عربی لکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت بھی لازمی ہے۔

- روزمرہ میں استعمال ہونے والی عربی زبان اور عربی پڑھنے والے طالبِ علموں کو معاصر تقاضوں سے جوڑنے کی ایک بڑی کوشش
- باوقار روزگار کے موقعوں سے جوڑنے کے لیے اس کورس کو عربی شارٹ ہینڈ اور کمپیوٹر پیکیج سے جوڑنے کی کوشش

یہ کورس دو سال کی آٹھ اکائیوں (Modules) میں منقسم ہے۔ ہر سال کے لیے چار اکائیاں (Modules) (دو کتابوں کی شکل میں) ہیں جن میں بتیس اسباق عربی مکالمے (Dialogues) پر مشتمل ہیں۔ ہر اکائی میں تدریبات ہیں۔ ہر دو اکائیوں کے لیے گائڈ بک بھی ہے جو عربی مکالمے پر مشتمل اسباق کی اکائیوں سے علاحدہ کتاب کی شکل میں ہے۔ ہر سال چار اکائیاں (Modules) یعنی دو کتابیں مع دو گائڈ بک اور متعلقہ اکائیوں کے اسباق و تدریبات پر مبنی دو جوابی پرچے (Response Sheets) کونسل کی طرف سے ارسال کیے جائیں گے۔ طلبہ ہر چھ ماہ کے بعد جوابی پرچہ کونسل کو ارسال کریں گے۔ جوابی پرچے کی بنیاد پر کامیاب طلبہ کو دوسرے سال کی چار اکائیاں یعنی دو کتابیں مع دو گائڈ بک اور دو جوابی پرچے ارسال کی جائیں گی۔ کامیاب طلبہ کو کونسل کی طرف سے ڈپلومہ سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔ جوابی پرچے کی کارگزاری کی بنیاد پر فیل ہونے والے طلبہ دوسرے سال اس کورس کو مکمل کر کے کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس میں کامیاب ہونے کے بعد ہی کونسل ڈپلومہ سرٹیفکیٹ دے گی۔

فیس: فارم اور رجسٹریشن کے لیے 105 روپیہ کا ڈرافٹ Director, NCPUL, New Delhi کے نام رجسٹرڈ پوسٹ سے کونسل کو ارسال کریں۔ رجسٹریشن فیس کے علاوہ کوئی فیس نہیں ہے۔
یہ کورس مدرسے کے طالب علموں کے لیے مختص ہے۔ دفتری سہولیات کے پیشِ نظر طالب علم ایک ہی ڈرافٹ مدرسے کے صدر / سکریٹری / منیجر / استاد عربی کی طرف سے ارسال کریں۔ رجسٹریشن فارم مدرسے کو ہی ارسال کیا جائے گا۔

تفصیل کے لیے رابطہ قائم کریں :

ایجوکیشن سیل، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔8 ونگ نمبر۔7، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066
فون: 26169416, 26109746

مشیر الحسن

چھٹی قسط

جان کمپنی سے جمہوریہ تک جدید ہندستان کی کہانی

دوسرے دن شیعہ کالج میں اس کی تقریر اچھی رہی۔ جب پردیپ اور جگ موہن یونیورسٹی آئے تو صبح بڑی روشن اور دھوپ بڑی تیکھی تھی۔

عزیز کا ہاتھ زور سے پکڑتے ہوئے کہ کہیں وہ اپنا خیال بدل نہ دے، جگ موہن نے جلدی سے پوچھ لیا، "ہم کہاں بیٹھ کر باتیں کر سکتے ہیں؟"

عزیز مسکرا دیا۔ وہ اس وقت بے تکلفی اور یار باشی کے موڈ میں تھا، "اوپر، میرا خیال ہے۔ اوپر میرا آفس ہے۔ چھوٹا سا آفس"۔

عزیز نے سگریٹ بجھائی اور اسے گھاس پر پھینک دیا۔ اور اپنے ہاتھ اپنی مٹیالی نیلی پتلون کی جیبوں میں ڈال لیے۔ سارے دوست اس کے پیچھے پیچھے زینے پر چڑھ کر اس کے نام کی تختی لگے ہوئے کمرے میں داخل ہو گئے۔ کئی طالب علم دیوار سے ٹیک لگائے اور کئی کمرے سے باہر زمین پر بیٹھے تھے۔ کمرے میں فرنیچر برائے نام تھا۔ اس میں پلائی ووڈ کی ایک میز اور لوہے کی تین فولڈنگ کرسیاں پڑی تھیں۔ عزیز خود میز پر رکھے ہوئے اخباروں کے ایک ڈھیر کے پاس بیٹھ گیا اور اپنے دوستوں کو کرسیوں پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے اور خرافات کا لین دین کرتے رہے۔ پردیپ نے، جو پلتھی مارے بیٹھا ہوا تھا، اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکالی اور مشتاق نگاہوں سے عزیز کی طرف مڑا۔

"اچھا تو نئے ہندستان کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے؟" عزیز کی آواز گونجی۔ "میرے بعض ساتھیوں کا خیال ہے کہ اٹھارہویں صدی سے شروع کرنا کچھ بہت مناسب نہیں ہے کہ اٹھارہویں صدی کا زمانہ خود ایک غیر ذمہ دارانہ، جھنجھلاہٹ، طوائف الملوکی اور غلبے اور تسلط کا زمانہ تھا۔ انھیں انحطاط کی کہانی پیچیدہ اور غیر واضح معلوم ہوتی ہے۔"

"کیوں؟" پردیپ نے پوچھا۔

"اٹھارہویں صدی کا سماج" عزیز نے جواب دیا۔ "انحطاط اور طوائف الملوکی کے اس رسمی stereotype سے کہیں زیادہ متنوع تھا جس کو شروع کے چند انگریز تاریخ دانوں اور کچھ ہندستانی مورخوں نے دوام بخشا تھا۔ پہلی بات تو یہی کہ صوبے علاقائی بنیادوں پر بنی ہوئی اکائیاں تھے جن میں مختلف طاقت ور گروہوں نے اپنے آپ کو مستحکم کر لیا تھا اور محنت (کام گاروں) اور پیداوار پر اپنے اختیار کی پکڑ مضبوط کر لی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا تھا کہ سیاسی لامرکزیت نے شاہی راجدھانیوں سے دور کے علاقوں میں اقتصادی توانائی پیدا کر دی اور درباروں (courts) اور حیدر آباد، پونا، ناگپور، گوالیار اور حیدر علی کے میسور کے امراء و رؤسا کی چھاؤنیوں (camps) کے اطراف بڑے بڑے زرعی اور تجارتی کاروبار کے جزائر سے وجود میں آ گئے۔ ٹھیک ہے کہ تبدیلی کے جلو میں اقتصادی اتھل پتھل، کسانوں کی بغاوت، سیاسی تغیر اور بیرونی جارحیت بھی آئی۔ لیکن پھر بھی، سلطنت کے انحطاط اور استعمار کی آمد جیسے سیدھے سادھے خیال کے محدود دائرے سے باہر بھی بہت کچھ ہو رہا تھا"۔

عزیز کے ہونٹ بھنچ گئے۔ وہ رنگ پر آ رہا تھا۔ "اودھ، بنگال، پنجاب اور وسیع مرانٹھا عمل داری سے متعلق مطالعات وسائل کے انحطاط سے زیادہ ان کی از سر نو تقسیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ اسٹڈیز اودھ میں مرکزی اور جنوب کے ان اضلاع کے انتظامیہ اور وہاں کی سیاست میں استحکام اور اقتصادی ترقی کا انکشاف بھی کرتی ہیں جو آگرہ اور الہٰ آباد کے صوبوں میں گنگا کے جنوبی کناروں کے قصبات سے منسلک تھے۔ دوسری طرف، ان مقامات میں جاٹوں کی بستیوں کے بسنے کے نتیجے کے طور پر، پنجاب میں زرعی خوشحالی تھی جہاں بیک وقت باقاعدہ بارش، وسیع و عریض دریا گزار علاقے اور زرخیز زمینیں تھیں۔ دوسرے الفاظ میں مغل سماجی نظام کی شکست و ریخت کرنے کے بجائے، اٹھارہویں صدی کے بہت سے حکمرانوں نے، ترقی، احیاء اور حیات نو کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کیا۔"

عزیز نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی، اس کا چہرہ تاثرات سے یکسر عاری تھا۔

پردیپ اور جگ موہن نے اگر عزیز سے ان لوگوں کے بارے میں سوال کیا ہوتا، جنھیں مذکورہ سلسلے میں فائدہ پہنچا تو اس نے انھیں یقیناً یہ بتایا ہوتا کہ زراعتی پیداوار اور تجارت کی ترقی اور وسعت اور لگان کی نسبتاً زیادہ علاقوں میں وصولی نے تاجروں، سرکاری ملازموں اور زمین داروں کو فائدہ پہنچایا۔ اسی کے ساتھ اُس نے اٹھارہویں صدی کے سیاسی نظام اور سماج کے اس منظر نامے پر تاریخ دانوں میں اختلاف رائے کی طرف بھی اشارہ کیا ہوتا۔ اگر اسے یہ بتایا جاتا کہ محض لڑائیوں کی تاریخ کی بنیاد پر ہونے والی روایتی دو شاخی تقسیم رسمی اور ضابطے کی کارروائی تھی تو وہ اتفاق کرتا۔ مگر اُس نے اسے تسلسل و ترقی کے نظریات کے مقابلے میں، ہندستان کی سماجی اور اقتصادی تاریخ کے حقائق سے معروضی طور پر زیادہ قریب قرار دیا ہوتا۔

ایک ایسے عہد کے مطالعے کے لیے، جب شاہی اختیار کمزور اور غیر محفوظ ہونے کے باوجود، ان سرداروں اور فرماں رواؤں کے لیے اتحاد و

معاونت کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا جو اپنے اپنے علاقوں میں اپنے کس بَل کی نمائش کر رہے تھے۔ اُسے ایک دہلی مرکز زاویۂ نگاہ سے اختلاف نہ ہوتا۔ پھر بھی یقیناً ایک ایسے سماج کے اقتصادی اور سماجی اسرار کو کھولنے کے لیے جو مختلف طاقتوں (عوامل) کے زیر اثر بدل رہا تھا، اگرچہ تبدیلی بتدریج تھی، علاقائی مطالعات کی اہمیت کو اس نے اچھی طرح جتا دیا ہوتا۔ اس نے اپنے دوستوں کو یہ بھی بتایا ہوتا کہ یہ وہ کچھ ہے جس کی چند تاریخ داں تفتیش شروع کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر، یہ لوگ شمال مشرقی پنجاب میں تشکیلِ ریاست کے عوامل کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں جفاکش اور تندرست جاٹوں کو ذات کی درجہ بندی میں شودروں کی جگہ پہنچا دیا گیا تھا اور وہ اپنی پہچان کو بچانے اور قائم رکھنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ ایسی تحقیق و تفتیش اس موجودہ بحث میں مدد کرتی ہے کہ آیا یہ رجحانات دہلی میں مغل اختیار و اقتدار کی چالوں سے بے نیاز اور آزاد رہ کر فروغ پا رہے تھے یا پھر ان کے پیچھے ذات پات، رشتے داری اور کلچر کی طاقت ور دیسی روایتیں بھی تھیں۔

'بہر حال فی الوقت' عزیز نے قطعیت کے ساتھ کہا، "یہ کہا جا سکتا ہے کہ انحطاط و خوش حالی کی کوئی ایک تاریخ یا کوئی ایک قسم تمام علاقوں پر منطبق کی جانے والی نہیں معلوم ہوتی ہے۔"

پردیپ اپنی نوٹ بک کے اوراق کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے ایک دم بولا، "تم کیا کہہ رہے تھے؟ ہندستان کے بارے میں کسی کلیے کا اُس فرضی کہانی کے ہاتھی کی طرح ہونا ضروری ہے جس میں پانچ نابینا آدمی جانور کے جسم کے الگ الگ حصوں کو چھو چھو کر ٹٹول کر ہم نوا ہو گئے تھے"۔

عزیز نے متحیر ہو کر ایک طویل نگاہ پردیپ پر ڈالی۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ جگ موہن "لائف" میگزین سے پھاڑی ہوئی ایک تصویر کو دیکھ رہا ہے جس میں کاسابلانکا کانفرنس کے موقعے پر دھوپ سے روشن ایک باغ میں روزولٹ اور ونسٹن چرچل ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے ہیں۔

"محترم دوست، اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھوں، میں آپ سے درخواست کروں گا کہ میری بات کو غور سے سنیے۔

جگ موہن کچھ شرما سا گیا۔

"حضور، معافی چاہتا ہوں"، اس نے دبے دبے کہا۔

عزیز نے اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلایا، شانوں کو جنبش دی، "انگریز فلسفی برٹرانڈ رسل لکھتا ہے کہ تاریخ کو قابل دست رس ہونا چاہیے اور دریافتیں موضوعی رسائل، علمی جریدوں اور غیر مطبوعہ مقالوں میں بند نہیں رہنا چاہئیں۔ اس کا کہنا ہے کہ تاریخ دانوں کے لیے اگر انھیں اپنی سماجی ذمے داریاں پوری کرنا ہے تو ترکیب و امتزاج کا عمل بہت ضروری ہے اور میں یہی کرنے نکلا ہوں۔"

جگ موہن کچھ بڑبڑایا، جس کا مطلب ہم اپنے دوست کے اس جذبے اور لگن پر اس کا حیرت و استعجاب قرار دے سکتے ہیں۔

"کیا تمھارے لیے کوئی معتبر و مستند اور جامع ہندستانی موضوع کام کرنے کے لائق نہیں ہے؟" اس نے بے جھجک پوچھ لیا۔

"نہیں، میں ایسا نہیں سمجھتا"۔ عزیز نے اپنے خصوصی متوازن انداز میں کہا، "میں استعمار کی توسیع اور اس کے عواقب کے کچھ پہلوؤں کو، ایک گورکھ دھندے کی طرح، انتہائی محنت سے جوڑنے اور بٹھانے کی کوشش کروں گا، میں کسی انوکھی یا نئی پیش کش کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں کیونکہ میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں وہ زیادہ تر مستند اور مستحکم تاریخ دانوں کی تحریروں پر مبنی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کام ختم کرنے کے بعد میں مطالعے کی کتابوں کی فہرست منسلک کر دوں۔ یہ میرے طالب علموں کے لیے بھی مفید ہو گی۔

ایک فاضل مورخ سے تاریخ پڑھنے کے امکانات پر پردیپ کچھ بڑا مشتاق و مضطرب سا لگا۔ "اُو کے۔ یہ بڑا زبردست آئیڈیا ہے۔"

"ٹھیک ہے"، عزیز نے کسی قدر تغافل کے ساتھ دہرایا۔

"کبھی کبھی میرا انداز پیغمبرانہ ہو سکتا ہے کیونکہ میں مستقبل کے تاریخی رجحانات کا ادراک اور ان کی شناخت ان تحریروں کی بنیاد پر کرتا ہوں جو آج لکھی جا رہی ہیں۔ مثلاً تم ہی دیکھتے ہو کہ سوشل سائنٹسٹ کس طرح استعماریت اور قومیت سے متعلق اپنے نظریات اور اپنی تاویلوں پر نظر ثانی کرنے کا آغاز کرتے ہیں۔ پچھلی چند صدیوں میں ہونے والے ہمارے تجربات کی تاویلِ نو کے لیے نئے مدرسہ ہائے فکر وجود میں آئیں گے۔ مجھے امید ہے کہ ہم لوگ، انیسویں صدی اور اپنی حالیہ لفظیات و اصطلاحات سے آگے جائیں گے۔ قصہ مختصر میرے عزیز، کمپنی کے زمانے سے لے کر آزادی کی صبح تک کے واقعات کا میرا بیان، واقف قارئین کی بھوک کو تو شاید نہ مٹا سکے، مگر تم، جس نے ابھی کچھ بہت تاریخ نہیں پڑھی ہے، شاید .... میں اپنا جملہ پورا نہ کروں گا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دن میں وہ سب ضبطِ تحریر میں لاؤں جو میں تم سے کہتا ہوں، تم سے سنتا ہوں۔ یہ خیال میرے ذہن میں پک رہا ہے۔ لکھوں گا اور پھر دنیا کے سامنے اعلان کروں گا۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

عزیز کو میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کا حوالہ دینے میں بہت لطف آتا۔ سید احمد خاں، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، آزاد، خان عبدالغفار خاں اور رفیع احمد قدوائی کا ذکر کرنا اسے اتنا ہی اچھا لگتا تھا جتنا کہ بنگال کے لوگ بنکم چندر چٹرجی، اربندو گھوش، سوامی وویکانند اور ربندر ناتھ ٹیگور کے تذکرے سے اور کچھ پنجابی دیانند سرسوتی، لاجپت رائے اور سوامی شردھانند کے ذکر سے

لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے کسی خیال یا اپنی کسی بات کو موثر بنانے کے لیے کربلا اور شہادتِ امام حسین کے واقعات کو بھی استعمال کرتا۔ کیوں؟ اس کے بعض ساتھیوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ وہ خود ثقافت اور دانش وری کی کچھ مخصوص روایات کا پروردہ ہے اور ان سے نسبتاً زیادہ مانوس۔ دنیا کی تاریخ سے اس کی واقفیت اچھی تھی، مگر تاریخِ اسلام سے اس کی واقفیت کچھ اور بہتر تھی۔ اس کا دنیا کا تصور بدرالدین طیب جی، اجمل خاں، انصاری، غفار خاں اور رفیع صاحب کے تصور سے مختلف نہیں تھا۔

"پھر وہ کون سی جگہ ہے جہاں یہ آوازیں نہیں سنی جائیں گی۔" وہ کبھی کبھی اپنی بیوی طلعت سے پوچھتا۔ "ان کو اگر وہ اپنے بیانیہ میں نہ لائے تو اور کون لائے گا؟"

کچھ برسوں سے علی گڑھ اور جامعہ کے مسلمان دانش ور اپنے روشن خیال (لبرل) ورثے کے بارے میں کچھ مدافعتی ہو گئے ہیں۔ عزیز ان حضرات سے الگ تھا۔ دو قومی نظریے کے ثقافتی اور نظریاتی بوجھ کو اٹھانے کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کے والد نے ہندستان میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا، اس کے خسر ایک کٹر کمیونسٹ تھے اور قوم پرست تھے۔ خود اختیاری (self determination) کے اصول پر پاکستان کی تحریک کی جب ان کی پارٹی نے حمایت کی تو انھوں نے پارٹی سے اتفاق نہیں کیا۔

عزیز کو لکھنؤ، علی گڑھ یا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جب کبھی کسی سالانہ تقریری مقابلوں میں جج کے فرائض ادا کرنے کی ذمے داری سونپی گئی تو اس نے ایسے موقعوں پر ہمیشہ مولانا آزاد کی رام گڑھ کانگریس سیشن (1940) والی تقریر کا حوالہ ضرور دیا۔ اپنے سیاسی عقیدے کے اظہار کا یہ اُس کا اپنا طریقہ تھا۔

> "میں مسلمان ہوں" مولانا نے اعلان کیا۔
>
> "اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔
>
> بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک حصہ ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے، میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا............"۔

عزیز عموماً طالب علموں سے اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہوئے انھیں وسیع النظر ہونے اور دوسروں کو برداشت کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ اس کا تاثر بہر حال یہ تھا کہ لوگوں کے رویّوں میں تبدیلی کی رفتار منظر کی تبدیلی کے مقابلے میں کہیں سست ہے۔

"کاش میں وہاں ہوتا"، پردیپ نے جگ موہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "مولانا کو داد دینے کے لیے۔ ویسے عزیز بھائی خود بھی اتنی ہی زوردار تقریر کر سکتے تھے۔"

"مجھے اتنا اعتماد نہیں ہے۔ بہر حال دسمبر میں محرم کے لیے میں علی گڑھ کے ضلعے میں اپنے موروثی گاؤں جلالی جا رہا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں میرے خسر اقبال مہدی، اس کہانی کو پورا کردیں گے۔ وہ ترقی پسند کہلاتے ہیں، اور انھیں نیشنلسٹ جدوجہد کے نشیب و فراز سے بڑی دلچسپی ہے۔ انھوں نے آر سی دت کی اقتصادی تاریخ ہند (Economic History of India) پڑھی ہے اور پرانے کانگریسی قوم پرستوں کی پیش کی ہوئی Drain Theory پر تقریر کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ رجنی پام دت کی تحریروں کے معترف ہیں۔ اقبال مہدی صاحب علی گڑھ میں خواجہ احمد عباس کے ہم عصروں میں تھے۔ ترقی پسند مصنفین سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ منشی پریم چند، سجاد ظہیر اور ملک راج آنند جیسے تحریک کے موسسین سے بھی ملے ہیں۔ نوجوان شعرا علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی سے بھی ان کی واقفیت ہے۔ تمھیں پتہ ہے؟ 1936 میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہمارے ہی شہر میں ہوئی تھی۔ پریم چند نے اس کی صدارت کی تھی۔ (رودولی کے چودھری محمد علی اس کی ریسپشن کمیٹی میں تھے) افسوس آپ لوگ ان چیزوں کے بارے میں بات نہیں کرتے۔ مجھے ڈر ہے کہ ادب کی اس ترقی پسند تحریک کی تاریخ آہستہ آہستہ عوامی حافظے سے محو ہو جائے گی۔

یہ معقول اور معتدل باتیں کر کے عزیز چلے گئے۔

تقریباً دو ہفتے گزرنے کے بعد تینوں دوست پھر ملے، اس دوران قتل، آتش زنی اور زنا کی کہانیاں زبان زدِ عام تھیں۔ فطری طور پر، لکھنؤ کے لوگ جو زندگی کے نشیب و فراز اور اس کی نیرنگیوں سے مانوس تھے، پُر سکون

رہے۔ زندگی حسب معمول چلتی رہی۔ اکثر لوگ اپنی زندگی سے مطمئن تھے اور سیاست دانوں کی تقریروں سے اپنے مضبوط ذہنی اور ثقافتی رشتوں کو کمزور بنانے پر تیار نہیں تھے۔
بارہ دری سے، جواب ایک ویران جگہ ہے، ایک تنہا تنہا سی آواز اقبال کی یہ نظم پڑھتے ہوئے سنائی دی۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہوگئے پُرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھادیں
بچھڑوں کو پھر ملادیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملادیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

نفرت، انتقام اور الزام تراشیوں کی فضا میں ایسا لگتا تھا جیسے یہ اشعار عہدِ رفتہ سے آتی ہوئی کوئی آواز ہو۔

(مترجم: مسعود الحق)

مصنف کا پتا :
139, Uttarakhand, J.N.U., New Delhi - 110 067

•••

कौमी काउन्सिल बराए फ़रोग़-ए-उर्दू ज़बान
قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
National Council for Promotion of Urdu Language
M/o Human Resource Development, Deptt. of Secondary & Higher Education, Govt. of India

مقام
صابو صدیق پالیٹکنک
بائی کلا، ممبئی

تیسرا کل ہند اردو کتاب میلہ
(तीसरा कुल हिन्द उर्दू किताब मेला)

تاریخ
4 تا 12 جنوری 2003

اشتراک : نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، انجمن اسلام (ممبئی)، مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی

کتابیں ماضی کا اثاثہ، حال کا سرمایہ اور مستقبل کی اساس ہیں

ملک بھر کے مشہور و ممتاز اردو ناشرین کی شرکت متوقع ہے

فارم طلب کریں: **قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان**

ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 6169416, 6109746، فیکس: 6108159، ای میل: urdueducation@hclinfinet.com

عظیم صدیقی

کمپیوٹر کالم

مائکروسافٹ ورڈ

میدان (Field)

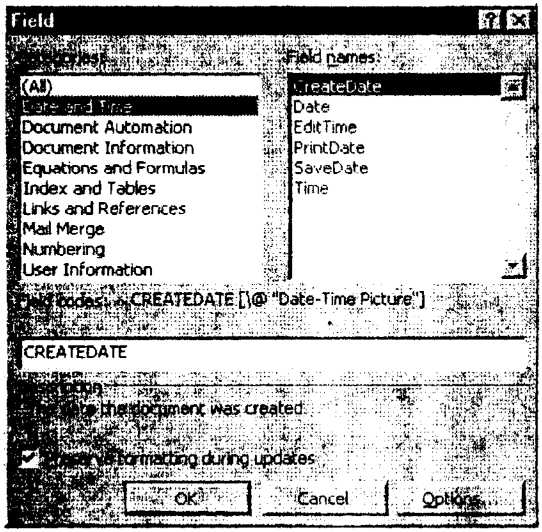

- دستاویزات میں میدان وہ جگہ ہے جو کسی تغیر پذیر رکن کے لیے خالی رکھی جاتی ہے، جیسے تاریخ، مکتوب الیہ کا نام و پتہ، کتاب کے حوالہ جات، نمبر شمار وغیرہ وغیرہ۔
- جس جگہ یہ میدان چھوڑنا ہو اس جگہ کرسر لے جاکر کلک کیجیے۔
- اب مدخولات (Insert) کی فہرست کھول کر میدان پر کلک کریں۔ یہ استفسار یہ نکل آئے گا۔
- یہاں تاریخ و وقت (Date and Time) پر کلک کیجیے۔
- الٹے ہاتھ کی فہرست میں Createdate منتخب ہے۔
- متبادلات (Options) پر کلک کر کے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔
- OK پر کلک کریں۔
- وقت اور تاریخ جھلملاتے کرسر کی جگہ وارد ہو جائے گی، اس طرح آپ دوسرے ارکان کے میدان اپنی دستاویز پر نافذ کر سکتے ہیں۔

علامتیں (Symbols)

- کبھی کبھی متن میں خاص طور پر حساب، الجبرا یا سائنس میں مستعمل علامتیں یا دوسری زبانوں کے حروف مخصوص معنوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔
- مثال کے طور پر © یہ علامت کتابوں میں کاپی رائٹ (جملہ حقوق محفوظ) کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ لغات میں ÀÁÂÃÄÅ اس قسم کے حروف ہجی تلفظ کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یونانی زبان میں یہ لفظ μ (میو) طبیعات میں روشنی کے انعکاس کے زاویہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ θ تھیٹا — علم مثلث (Trignometry) میں زاویہ کے لیے اور π

پائی- دائرہ کے محیط اور وتر کی نسبت کو ظاہر کرتا ہے۔ان مخصوص معنوں کے لیے ان علامات (Symbols) کا استعمال کیا جاتا ہے۔

- جہاں اس قسم کی علامتیں استعمال کرنی ہوں وہاں کرسر کو کلک کیجیے۔
- پھر مدخولات (Insert) کی فہرست میں جاکر علامات (Symbols) پر کلک کیجیے۔ یہ استفساریہ نکل آئے گا۔

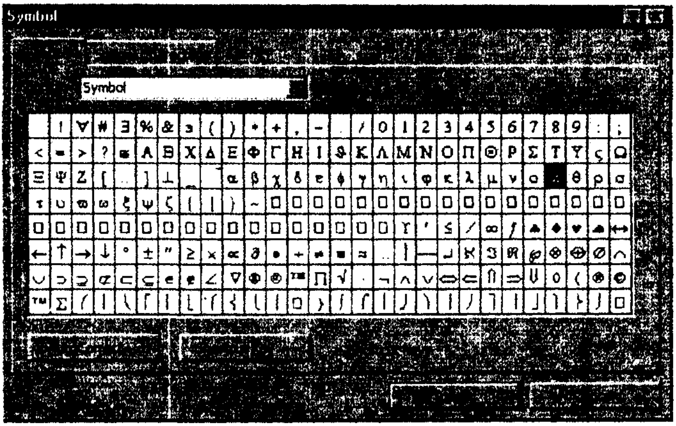

- اس میں سے جو علامت ڈالنی ہو اس پر کلک کریں۔ علامت بڑی ہو کر دکھائی دے گی۔
- اسی استفساریہ میں تدخیل (Insert) پر کلک کریں۔ یہ علامت متن میں جھلملاتے کرسر کی جگہ نافذ ہو جائے گی۔
- اس علامت کو عام خط کی طرح جلی (Bold) خفی(Small) یا کجی(Italics) میں منتخب کر کے منتقل کیا جاسکتا ہے۔
- اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ علامت پہلے ٹائپ شدہ کسی علامت کی جگہ لے تو،
- خودکار تصحیح (Auto Correct) پر کلک کیجیے۔ پھر جہاں کرسر جھلملا رہا ہو، وہاں پرانی علامت ٹائپ کر دیجیے۔
- OK کرنے پر نئی علامت دستاویز میں پرانی علامت کی جگہ نافذ ہو جائے گی۔
- اس علامت کو متعدد بار ڈالنے کے لیے بٹن مختصری (Short cut Keys) کا استعمال کیا جاسکتا ہے جس سے یہی کام کم وقت میں تختہ حجی سے کیا جاسکتا ہے۔
- اس کے لیے بٹن مختصری(Short-cut Key) پر کلک کیجیے۔
- وارد ہوئے استفسارچہ میں آپ جو بھی دو بٹن اس کام کے لیے مقرر کر کے OK کریں گے، وہی بٹن آئندہ دبانے سے یہ علامت متن میں آئے گی۔
- اس استفساریہ میں پنہاں استفساریہ علامات مخصوص (Special Characters) پر کلک کرنے سے وہ علامتیں دکھائی دیتی ہیں جن کے لیے پہلے ہی سے بٹن مختصری اس میں موجود ہیں جن کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جو اسی استفساریہ میں Special Character پر

کلک کر کے دیکھے اور منتخب کر کے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

تبصرہ (Comment)

- کبھی کبھی لفظوں یا پیرے میں کچھ راز پنہاں ہوتے ہیں جن کو زبانی بتانا بہتر سمجھا جاتا ہے یا اس کے متعلق کوئی پس منظر ہوتا ہے جو متن میں نہیں لانا چاہتے یا اپنی کوئی ذاتی رائے ہو سکتی ہے۔ MS Word میں یہ دونوں ممکن ہیں۔ اس میں آواز بھری جاسکتی ہے اور پنہاں تبصرہ بھی۔ ایسے الفاظ پر ہلکا سا رنگ چڑھا ہوتا ہے جس سے یہ پہچان ہوتی ہے کہ یہاں کچھ دال میں کالا ہے یعنی کچھ وضاحت موجود ہے۔
- اس طرح کے الفاظ جن کی کوئی وضاحت کرنا منظور ہو، منتخب (Select) کرلیں۔
- مدخولات (Insert) کی فہرست میں تبصرہ پر کلک کریں۔ ایک استفسار یہ نکل آئے گا۔
- جہاں کرسر جھلملا رہا ہو وہاں اپنا تبصرہ ٹائپ کریں۔
- Comments From میں اپنا نام ٹائپ کر سکتے ہیں۔
- Close کرنے پر تبصرہ نافذ ہو جائے گا۔
- جب بھی کرسر اس لفظ کے قریب آئے گا تو تبصرہ یوں عیاں ہو جائے گا۔ آواز ریکارڈ کرنے کے لیے Help پر کلک کر کے اس کی ہدایتوں پر عمل کریں۔

پانوشت اور پس نوشت (Foot Notes and End Notes)

- بالکل اسی طریقے سے جو اوپر بیان کیا گیا ہے آپ اپنی دستاویز میں پانوشت (Foot Notes) یا پس نوشت (End Notes) کا اضافہ کر سکتے ہیں۔
- پانوشت (Foot Note) اس وضاحت کو کہتے ہیں جو کسی لفظ یا جملے کی ہو اور وہ اسی صفحے کے نیچے لکھی ہو جس میں وہ جملہ یا لفظ موجود ہے۔ پانوشت اور لفظ میں رشتہ قائم کرنے کے لیے دونوں پر ایک ہی نشان یا نمبر لگایا جاتا ہے۔
- پس نوشت (End Notes) اس نوشت کو کہتے ہیں جو دستاویز کے آخر میں لکھی جائے۔

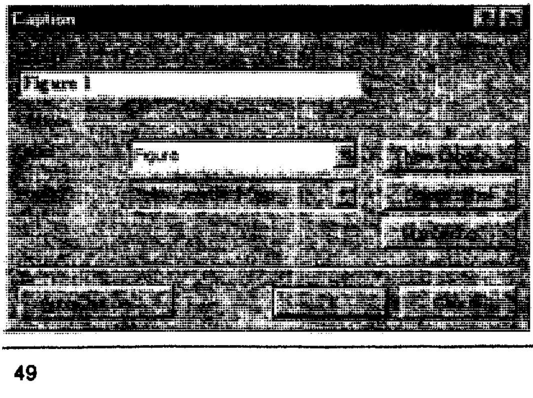

عنوانات (Captions)

- جو مسودے یا دستاویز تصویروں (Pictures)، خاکوں (Maps)، جدولوں (Tables)، یا مساوایات (Equations) سے مزین ہوں ان دستاویزوں میں ان تصاویر وغیرہ کے نیچے عنوانات لکھنے کی

ضرورت پڑتی ہے۔اس کام کے لیے استفساریہ سے کام لیا جاتا ہے، جو مدخولات کی فہرست پر عنوانات(Captions) پر کلک کرنے سے نکلتا ہے۔

- Label لیبل کے پیکان پر کلک کر کے مساوات(Equations)، تصاویر(Figures)اور جدول(Tables) کے متبادلات میں سے ایک کو چن لیا جاتا ہے۔
- New Label پر کلک کر کے عنوان سے پہلے کا متن ٹائپ کر لیا جاتا ہے۔جیسے باب نمبر(Chapter No) وغیرہ۔
- عنوان (Captions) کے نیچے بنے خانے میں پہلی تصویر کا عنوان(Caption) ٹائپ کر لیا جاتا ہے۔
- Numbering پر کلک کر کے نمبر شاری کے مختلف طرزوں میں سے ایک کا انتخاب کر لیجیے۔
- Auto Caption پر کلک کر کے مختلف کلیدوں میں سے ایک کا انتخاب کر لیجیے۔
- OK پر کلک کرنے سے یہ عنوانات آپ کی تصاویر، جدول یا مساوات پر چسپاں ہو جائیں گے۔

Cancel پر کلک کرنے سے سارے احکامات رد ہو جائیں گے۔

- اس کی مدد سے تصویروں، خاکوں اور نقشوں کے عنوانات کی ایک علاحدہ فہرست بھی بنائی جا سکتی ہے۔

آپسی حوالہ (Cross Reference)

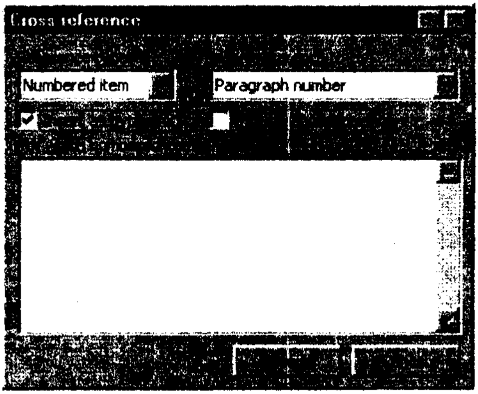

- یہ دستاویز ان خاص مقامات کی نشان دہی کے لیے استعمال ہوتا ہے جن میں کوئی آپسی حوالہ موجود ہو۔اس پر کلک کرنے سے یہ استفساریہ نکل کر آتا ہے۔اس میں Reference Type کے تحت وہ ارکان لکھے ہیں جن کو نشان زد کرنے میں یہ کام آ سکتا ہے۔یہ جبھی کام آ سکے گا جب یہ ارکان آپ کی دستاویز میں موجود ہوں۔یہاں مثال میں Foot Notes موجود ہیں۔باقی آپ خود کھول کر دیکھ سکتے ہیں۔

حوالہ برائے Insert Reference to میں پہلا حوالہ نشان زد کریں جس کا حوالہ دوسرے حوالے کے ضمن میں دے رہے ہیں۔

حوالہ برائے ... For which میں دوسرا حوالہ نشان زد کریں۔

Insert پر کلک کرنے پر یہ دونوں حوالے ایک دوسرے پر منطبق ہو جائیں گے۔

(جاری)

مخمور صدری

کوئز

اردو کی ادبی تحریکیں اور ادارے

(1) ایہام گوئی میں کسے امتیاز حاصل ہے؟
(الف) شاکر ناجی (ب) شرف الدین مضمون
(ج) خاں آرزو (د) شاہ مبارک آبرو

(2) وہ شاعر جس نے ایہام گوئی کی مخالفت میں تحریک شروع کی تھی؟
(الف) شاہ حاتم (ب) انجام
(ج) مرزا مظہر جانِ جاناں (د) ان میں سے کوئی نہیں

(3) اصلاحِ زبان کی تحریک کس نے چلائی؟
(الف) ناسخ (ب) میر
(ج) انجام (د) مصحفی

(4) نظیر اکبر آبادی کس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں؟
(الف) دبستانِ لکھنؤ (ب) دبستانِ دلی
(ج) دبستانِ رام پور (د) ان میں سے کوئی نہیں

(5) دبستانِ لکھنؤ کے کن دو شعرا کے درمیان معرکہ آرائی تھی؟
(الف) مصحفی۔ انشاء (ب) جرأت۔ ناسخ
(ج) میر۔ سودا (د) میر حسن۔ نظیر

(6) دبستانِ عظیم آباد کے معماروں میں کس شاعر کا نام آتا ہے؟
(الف) شاد عظیم آبادی (ب) راسخ عظیم آبادی
(ج) موزوں (د) شورش

(7) فورٹ ولیم کالج کا قیام کب عمل میں آیا؟
(الف) 4 مئی۔ 1955 کو
(ب) 2 جنوری 1805 کو
(ج) 10 جولائی 1800 کو
(د) 1 فروری 1799 کو

(8) فورٹ ولیم کالج کا افتتاح کس نے کیا؟
(الف) وارن ہسٹنگز (ب) لارڈ ولزلی نے
(ج) جان گل کرسٹ نے (د) چارلس دوم نے

(9) فورٹ ولیم کالج کے پہلے پرنسپل کون تھے؟
(الف) ڈیوڈ براؤن (ب) لارڈ ولزلی
(ج) وارن ہسٹنگز (د) ان میں سے کوئی نہیں

(10) فورٹ ولیم کالج کب بند ہوا؟
(الف) 1854 میں (ب) 1888 میں
(ج) 1857 میں (د) 1858 میں

(11) فورٹ ولیم کالج میں ہندستانی شعبے کے صدر کون تھے؟
(الف) لارڈ ولزلی (ب) وارن ہسٹنگز
(ج) جان گل کرسٹ (د) ان میں سے کوئی نہیں

(12) جان گل کرسٹ نے فورٹ ولیم کالج سے استعفیٰ دیا تھا؟
(الف) 1862 میں (ب) 1803 میں
(ج) 1805 میں (د) 1804 میں

(13) "ہندستانی لغت" کے مصنف کون ہیں؟
(الف) محمد حسین آزاد (ب) سرسید
(ج) جان گل کرسٹ (د) مولانا حالی

(14) اردو سرکاری زبان کب بنائی گئی؟
(الف) 1832 میں (ب) 1800 میں
(ج) 1830 میں (د) 1825 میں

(15) دلی کالج کب قائم ہوا تھا؟
(الف) 1822 میں (ب) 1825 میں
(ج) 1827 میں (د) ان میں سے کوئی نہیں

(16) دلی کالج کے پہلے پرنسپل کون تھے؟
(الف) جے۔ ایچ۔ ٹیلر (ب) سرچارلس مٹکاف
(ج) لارڈ ولیم (د) لارڈ آکلینڈ

(17) ورناکلر سوسائٹی کب اور کہاں قائم ہوئی تھی؟
(الف) 1840، اورینٹل کالج لاہور
(ب) 1843، دلی کالج
(ج) 1845، فورٹ ولیم کالج
(د) 1846، ایم۔ اے۔ او کالج، علی گڑھ

(18) ماسٹر رام چندر کس کالج سے منسلک تھے؟

(الف) دلی کالج (ب) اورینٹل کالج

(ج) ایم۔اے۔او کالج، علی گڑھ (د) فورٹ ولیم کالج

(19) دلی کالج کا خاتمہ ہوا؟

(الف) 1857 میں (ب) 1858 میں

(ج) 1877 میں (د) 1854 میں

(20) سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد کب اور کہاں رکھی گئی تھی؟

(الف) 1860، علی گڑھ (ب) 1863، غازی پور

(ج) 1875، دہلی (د) 1865، کلکتہ

(21) سائنٹفک سوسائٹی کے پہلے سکریٹری کون تھے؟

(الف) سر سیّد احمد خاں (ب) کرنل گراہم

(ج) اسٹریچی (د) ڈاکٹر ڈبلو

(22) محمڈن لٹریری سوسائٹی کب اور کس نے قائم کی تھی؟

(الف) 1863 میں سر سیّد نے

(ب) 1873 میں محمد حسین آزاد نے

(ج) 1870 میں نذیر احمد نے

(د) ان میں سے کوئی نہیں

(23) "تہذیب الاخلاق" کی سنہ اشاعت ہے

(الف) 1890 (ب) 1889

(ج) 1870 (د) 1869

(24) محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کا قیام کب ہوا تھا؟

(الف) 1880 میں (ب) 1886 میں

(ج) 1889 میں (د) 1888 میں

(25) مدرستہ العلوم کی بنیاد کب اور کہاں رکھی گئی تھی؟

(الف) 25/اکتوبر 1876، بجنور

(ب) 26/مئی 1864، علی گڑھ

(ج) 22/مارچ 1877، دلی

(د) 24/مئی 1875، غازی پور

(26) محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کب بنایا گیا؟

(الف) 8/جنوری 1878 (ب) 20/جنوری 1876

(ج) 30/فروری 1877 (د) ان میں سے کوئی نہیں

(27) محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا سنگ بنیاد کس انگریز کے ہاتھوں رکھا گیا تھا؟

(الف) لارڈ ولزلی (ب) لارڈ لٹن، وائسرائے ہند

(ج) مسٹر ٹیلر (د) ان میں سے کوئی نہیں

(28) سر سیّد نے اردو یونی ورسٹی کا خاکہ کب پیش کیا تھا؟

(الف) 1870 میں (ب) 1867 میں

(ج) 1886 میں (د) 1878 میں

(29) سر سیّد کی کتاب "خطبات احمدیہ" کس انگریزی کتاب کا جواب ہے؟

(الف) لائف آف محمد (ب) محمد وی پروفٹ

(ج) پروفٹس آف اسلام (د) اسلام اینڈ اٹس پروفٹس

(30) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا اجرا ہوا تھا:

(الف) 21/جنوری 1889 کو (ب) 22/فروری 1877 کو

(ج) 19/مارچ 1866 کو (د) ان میں سے کوئی نہیں

(31) "انجمنِ پنجاب لاہور" کب قائم ہوئی تھی؟

(الف) 21/فروری 1864 کو

(ب) 21/جنوری 1865 کو

(ج) 21/مارچ 1866 کو

(د) 21/اپریل 1867 کو

(32) "انجمنِ پنجاب لاہور" کے صدر کون تھے؟

(الف) محمد حسین آزاد (ب) مولانا حالی

(ج) پنڈت من پھول (د) ڈاکٹر ڈبلو

(33) محمد حسین آزاد نے "انجمنِ پنجاب لاہور" کس کے ایماء پر قائم کی؟

(الف) کرنل ہالرائڈ (ب) لارڈ لٹن، وائسرائے ہند

(ج) سر سیّد احمد خاں (د) ان میں سے کوئی نہیں

(34) "انجمنِ پنجاب، لاہور" کے سکریٹری کون تھے؟

(الف) ڈاکٹر لائٹنر (ب) محمد حسین آزاد

(ج) مولوی کریم الدین (د) نذیر احمد

(35) رسالہ "انجمنِ اشاعتِ مفیدہ" کا ایڈیٹر کون تھا؟

(الف) بابو نوین چند رائے (ب) مولوی محمد حسین

(ج) محمد حسین آزاد (د) محمد باقر

(36) "خیالاتِ دربار نظم اور کلامِ موزوں" کس ادیب کا لیکچر ہے؟

(الف) کرم الٰہی (ب) گوپال داس

(ج) محمد حسین آزاد (د) ان میں سے کوئی نہیں

(37) "انجمنِ پنجاب، لاہور" سے کس صنف کا آغاز ہوا؟

(الف) مثنوی (ب) رباعی

(ج) نظم (د) غزل

(38) "انجمنِ حمایتِ اسلام" کہاں قائم ہوئی تھی؟

(الف) دہلی (ب) حیدر آباد

(ج) لاہور (د) رام پور

(39) "انجمن ترقی پسند مصنفین" کا قیام کب اور کہاں ہوا تھا؟

(الف) 1935، لندن (ب) 1936، پیرس

(ج) 1932، فرانس (د) 1931، ہندستان

(40) ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس کب ہوئی تھی؟

(الف) 1935 میں (ب) 1936 میں

(ج) 1934 میں (د) 1933 میں

(41) ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کہاں ہوئی تھی؟

(الف) علی گڑھ (ب) لکھنؤ

(ج) الہ آباد (د) دہلی

(42) پہلے کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس کی صدارت کس نے کی تھی؟

(الف) جواہر لال نہرو (ب) سجاد ظہیر

(ج) پریم چند (د) مولوی عبدالحق

(43) ترقی پسند انجمن کے سکریٹری کون تھے؟

(الف) محمد دین تاثیر (ب) ملک راج آنند

(ج) سجاد ظہیر (د) ان میں سے کوئی نہیں

(44) "حلقہ اربابِ ذوق" کب قائم ہوا تھا؟

(الف) 1939 میں (ب) 1937 میں

(ج) 1938 میں (د) 1940 میں

(45) "حلقہ اربابِ ذوق" کی بنیاد کہاں رکھی گئی تھی؟

(الف) دلّی (ب) لاہور

(ج) جالندھر (د) پنجاب

(46) حلقہ اربابِ ذوق کا سکریٹری کس کو بنایا گیا تھا؟

(الف) قیوم نظر (ب) میراجی

(ج) ن. م. راشد (د) محمد باقر

(47) "بزمِ داستان گویاں" کس رجحان سے تعلق رکھتا ہے۔

(الف) جدیدیت (ب) رومانیت

(ج) ترقی پسندی (د) حلقہ اربابِ ذوق

(48) "حلقہ اربابِ ذوق" کے بانی کون تھے؟

(الف) میراجی (ب) نصیر احمد جامعی

(ج) قیوم نظر (د) ان میں سے کوئی نہیں

(49) "انجمن تعمیر پسند مصنفین" کب اور کہاں قائم ہوئی تھی؟

(الف) 1948 لاہور (ب) 1949 اسلام آباد

(ج) 1950 کشمیر (د) 1960 جموں

(50) "حلقہ ادبِ اسلامی" کیا ہے؟

(الف) عربی ادارہ (ب) فارسی ادارہ

(ج) اسلامی ادارہ (د) اسلامی اردو لٹریچر ادارہ

(51) رسالہ "شب خون" کس رجحان کا علمبردار ہے؟

(الف) ترقی پسندی (ب) جدیدیت

(ج) رومانیت (د) حلقہ اربابِ ذوق

(52) کس شاعر نے "قصرِ ادب" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس میں نو آموز شعرا کے کلام پر اصلاح دی جاتی تھی؟

(الف) اکبر الہ آبادی (ب) چکبست

(ج) سیماب اکبر آبادی (د) جوش

□□□

307, Sutlej Hostel, JNU, New Delhi-67

کاشف الحقائق

(معروف بہ بہارستانِ سخن)

مصنف : سید امداد امام اثر

مرتب : ڈاکٹر وہاب اشرفی

یہ ایک اہم تنقیدی کتاب ہے جس میں نہ صرف اردو اور فارسی شعریات بلکہ عالمی شاعری کے بعض اہم پہلوؤں پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

(دوسرا ایڈیشن)، صفحات: 740 ، قیمت: 145

اڑیسہ میں اردو

مصنف: حفیظ اللہ نیولپوری

اڑیسہ میں اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا کی مکمل تاریخ اڑیسہ میں اردو تحریک کے اہم گوشے اہم شخصیتوں کے حوالے سے اجاگر کیے گئے ہیں۔

صفحات:504، قیمت:157

تاریخ تمدنِ ہند

مصنف : پروفیسر محمد مجیب

ہندستان ابتدائی زمانے سے مختلف تمدنوں اور تہذیبوں کی مطابقتوں اور عدم مطابقتوں کا گہوارہ رہا ہے اور یہاں کئی تہذیبیں تکمیل کو پہنچ کر زوال پا چکی ہیں۔ یہ کتاب یہی روداد بیان کرتی ہے۔

(تیسرا ایڈیشن)، صفحات:279، قیمت:72

کتابوں کی موبائل وین آپ کے شہر، آپ کے گاؤں میں

● قومی اردو کونسل کی موبائل وین نے اتر پردیش میں کتابوں کی نمائش و فروخت میں شاندار کامیابی حاصل کرنے کے بعد ایک اور بڑی اردو آبادی والی ریاست بہار کا رخ کیا اور یہاں بھی اس کی خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ پہلے مرحلے میں اس نے بکسر، بھوج پور، آرہ، اورنگ آباد، پھلواری شریف پٹنہ، سہسرام، نالندہ، جہان آباد اور گیا، اور دوسرے مرحلے میں گوپال گنج، سیوان، چھپرہ، حاجی پور، سمستی پور، در بھنگہ، مظفر پور، سیتا مڑھی موتیہاری اور بیتیا کے علاوہ گورکھپور کا دورہ کیا۔ قارئین نے بڑی تعداد میں کتابیں خریدیں اور قومی اردو کونسل کی اس کوشش کو بے حد سراہا۔ مختلف شہروں کے حوالے سے علاقائی اور قومی اخبارات میں شائع ہونے والی اس سلسلے کی چند خبریں یہاں پیش کی جارہی ہیں:

● در بھنگہ 9/ نومبر۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی موبائل وین حسبِ پروگرام آج سے در بھنگہ شہر کے محلہ کرم گنج، اور قلعہ گھاٹ چوک پر کتابوں کی نمائش کررہی ہے۔ آج در بھنگہ کے شائقین نے بڑی تعداد میں کتابوں کی خریداری کی۔ منظر سلیمان کی اطلاع کے مطابق کرم گنج، اردو بازار اور قلعہ گھاٹ میں اس وین کے قریب خریداروں کی خاصی بھیڑ تھی۔

(قومی تنظیم، پٹنہ)

● مظفر پور 13/ نومبر۔ اخباری اشتہارات کے ذریعے قبل سے اعلان شدہ پروگرام کے مطابق قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی موبائل وین کی آمد صبح 8 بجے اس شہر کے مولانا محمد علی جوہر چوک گویا پکی سرائے چوک پر ہوئی۔ اس موبائل وین میں مختلف النوع کتابوں کا ذخیرہ نظر آیا۔ خریداروں کی یکے بعد دیگرے کثیر تعداد بھی نظر آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کتابوں پر مشتمل وین کا پہلی بار بہار کے مختلف اضلاع کے دورے پر آنا ایک خوش آئند قدم ہے۔ اس کے سربراہ اس کے لیے ضرور قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے راجدھانی دہلی سے اردو کی اس موبائل وین کو ریاست بہار، جہاں اردو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے برسوں سے قائم ودائم ہے، اردو اضلاع کے سفر پر پہلی بار بھیجا ہے۔

(قومی تنظیم، پٹنہ)

● موتیہاری، 14 نومبر (رفیع احمد) بہار انجمن ترقی اردو کی شاخ مشرقی چمپارن کے صدر جناب انعام الحق نے اس امر پر خوشی کا اظہار کیا کہ قومی اردو کونسل کی موبائل وین اردو کتابوں کی نمائش و فروخت کے لیے بہار کے مختلف اضلاع کے دورے پر آئی ہے۔ 18 تا 19 نومبر کو مشرقی چمپارن کے صدر مقام موتیہاری میں مذکورہ موبائل وین کا انتظار بڑی بے صبری کے ساتھ یہاں کی اردو دنیا کررہی ہے۔

انعام الحق نے کونسل کے اٹھائے اقدام کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ منظم طریقے سے شہر کے کئی مقامات پر اشتہار چسپاں کیا جائے گا تاکہ ہر خاص و عام تک کتاب کی رسائی اور دستیابی ہو سکے۔ مختلف علمی، نصابی اور عصری موضوعات پر نیز بچوں کے لیے اردو کتب کی اشاعت اور اردو والوں تک ان کو پہنچانا تاریخ ساز کام ہے۔

کونسل کی موبائل وین کا خیر مقدم کرنے والوں میں پروفیسر انوارالحق، ڈاکٹر کے عالم، سابق یووا راجد صدر خورشید عزیز، انیس عالم سکریٹری انجمن اسلامیہ، ڈاکٹر شمس الحق، ڈاکٹر عطاء الرحمان انصاری، ڈاکٹر مبین ہاشمی اور جناب تفضیل احمد پیش پیش رہے۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

● موتیہاری 19 نومبر (رفیع احمد) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی موبائل وین کی موتیہاری آمد پر شہر کے اساتذہ، طلبا، دانشوران اور ادبا و شعرا نے اس کا والہانہ استقبال کیا اور کافی ذوق و شوق سے اپنی پسند کی کتابیں خریدیں۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی خاص طور پر ستائش کی گئی کہ ان کی کوششوں سے اردو کی نادر و نایاب کتابیں بہار کے دور دراز مقامات پر پہنچ رہی ہیں اور لوگوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل رہا ہے۔

موبائل وین کا معائنہ کرنے اور بڑی تعداد میں کتابیں خریدنے والوں میں پروفیسر فہیم محمد جان فیروز بھی شامل تھے۔ انھوں نے اس موقعے پر قومی اردو کونسل کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی وجہ سے چمپارن کے اردو دوستوں کی ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل ہوئی۔

انھوں نے کہا کہ آج جب کہ لوگوں کے اندر کتابوں کا شوق ختم ہوتا جا رہا ہے یہ لوگوں کو کتابوں سے جوڑنے کی ایک قابلِ تحسین کوشش ہے جس کی

تقلید کی جانی چاہیے اور اس کام میں ہر طرح کا عملی تعاون پیش کرنا چاہیے۔

موتیہاری میں قومی اردو کونسل کی وین کا استقبال کرنے والوں اور اس کی تشہیر کرنے والوں میں انجمن ترقی اردو کی مقامی شاخ کے صدر جناب انعام الحق، مرکز برائے پیش رفت، زبان و ادبیات فارسی و اردو کے اعزازی ڈائرکٹر پروفیسر رضوان اللہ آروی، روزنامہ "قومی تنظیم" کے مقامی نمائندے رفیع احمد، تفصیل احمد، شاہد جمیل اور ماسٹر محمد یوسف وغیرہ شامل تھے۔

موبائل وین کے انچارج جناب ولی صدیق نے شہر کے اردو دوستوں کے ذوق و شوق سے متاثر ہو کر خوشی کا اظہار کیا اور کتابوں کی فروخت پر بھی اپنے اطمینان کا اظہار کیا جب کہ رمضان المبارک اور اسکول و کالج بند ہونے کی وجہ سے قارئین مطلوبہ تعداد میں نہیں پہنچ سکے۔ موبائل وین کے دیگر ارکان میں جناب ناظر حسین اور جناب صدف علی نے اپنی فعالیت اور حسن اخلاق سے لوگوں کو کافی متاثر کیا اور اردو زبان کے فروغ کے لیے ہر ممکن طور پر لوگوں کا تعاون کیا۔ (قومی تنظیم، پٹنہ)

● گورکھپور 22 / نومبر- قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے پہلی بار شہر گورکھپور میں اردو کی نادر و نایاب کتابوں کی نمائش کی جا رہی ہے۔ اس سے قبل اتر پردیش اور بہار کے متعدد ضلعوں میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنی موبائل وین کے ذریعے کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا تھا۔

اسلامیہ کالج آف کامرس کے پرنسپل جناب شاہد جمال نے گورکھپور کے اردو داں طبقے خصوصاً کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات سے اپیل کی ہے کہ اس سنہرے موقعے سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔

(مشرقی آواز، گورکھپور)

● گورکھپور، 23 / نومبر۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کی جانب سے پہلی بار گورکھپور شہر میں اردو کی نادر و نایاب کتابوں کی نمائش کا اہتمام ہوا۔ آج کونسل کی موبائل وین کے آرگنائزر مسٹر ولی صدیق کی نگرانی میں ابو بازار، انجو امیں واقع ناصر لائبریری کے دروازے پر موبائل وین صبح 10 بجے پہنچی۔ محبانِ اردو کے ایک بڑے ہجوم نے اس کا خیر مقدم کیا اور دوپہر 12 بجے تک اس موبائل وین میں سجی کتابوں کا مشاہدہ کیا۔ کثیر تعداد میں کتابیں خریدی گئیں۔

آرگنائزر مسٹر ولی صدیق نے بتایا کہ کتابوں پر طلبہ کے لیے چالیس فی صد رعایت رکھی گئی ہے۔ اس موبائل وین میں دستیاب کتابوں میں مشہور کتاب "فسانۂ آزاد" سے لے کر منشی پریم چند کی کلیات تک موجود تھی۔ اس کے علاوہ سائنس، ٹیکنالوجی، جغرافیہ، تاریخ، ادب، صحافت اور الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ اردو انسائیکلوپیڈیا، نوراللغات اور فرہنگِ آصفیہ بھی موجود تھیں۔ کچھ کتابوں کی سبھی جلدیں موجود نہیں تھیں۔ بچوں کے لیے بھی وافر تعداد میں کتابیں موجود تھیں۔ آرٹ اور خوش خطی پر مبنی کتابیں بھی اس موبائل وین میں دستیاب تھیں۔ کتابیں خریدنے والوں میں خواتین اور بچوں نے زیادہ دلچسپی دکھائی۔ اس موقعے پر دانشوروں اور ادب نوازوں کا ایک بڑا طبقہ بھی موجود تھا۔ محبانِ اردو نے اسے بے حد پسند کیا اور اس سنہرے موقعے سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔

یہ موبائل وین ایک اور اردو ریاست بہار سے ہو کر آئی ہے اور اس کا ایک بڑا خزانہ گوپال گنج، سیوان، چھپرا، حاجی پور، سمستی پور، دربھنگہ، مظفرپور، سیتامڑھی اور بیتیا میں خالی ہو چکا ہے پھر بھی جو کچھ بچی کچھی کتابیں اہلِ گورکھپور کے حصے میں آئیں وہ بھی اتنے بڑے شہر اور مشرقی یوپی کے سب سے بڑے اردو علاقے کے لیے صرف دو دن بہت کم ہیں۔ اس موبائل وین کی خبریں عرصے سے اہلِ گورکھپور پڑھ رہے تھے اور دانشورانِ اردو، طلبہ و اساتذہ اکثر دریافت کرتے تھے کہ یہ موبائل وین گورکھپور کب آئے گی اور آئی تو "بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے"، کے مصداق رمضان میں آئی جبکہ اردو میڈیم اسکولوں اور مدارس میں تعطیلات ہیں، جہاں اردو کتب کی زبردست ضرورت ہے اور طلبہ اپنی علمی و ادبی تشنگی بجھانے کے لیے شہر کی لائبریریوں کا رخ کرتے ہیں۔ شہر میں کوئی ایسی دکان بھی نہیں جہاں مختلف فنون پر اردو میں کتابیں رعایتی قیمت پر دستیاب ہوں۔ آج بھی وین سے کتنے ایسے خریدار مایوس واپس گئے جنھیں ایک جلد میں اردو لغت یا اردو انگریزی و انگریزی اردو لغت کی ضرورت تھی۔ پتہ چلا کہ ایسی لغات بہار میں ہی ختم ہو چکی ہیں۔

بہر حال محبانِ اردو کے لیے یہ وین ویرانے میں بہار آنے سے کم نہیں ہے۔ آج یہ گاڑی 12 بجے کے بعد مقبرہ گرلز ڈگری کالج پر گئی جہاں طالبات اور ٹیچروں کے علاوہ شہر کی دیگر خواتین نے بھی کتابیں خریدیں۔ آج صبح موبائل وین کا خیر مقدم کرنے والوں میں ناصر لائبریری کے روشن صدیقی، اسلامیہ کالج آف کامرس کے پرنسپل شاہد جمال، قلم کار محمد احمد، ادیبہ و محقق ڈاکٹر درخشاں تاجور، اسلامیہ کالج کے استاد طارق ندوی و قلم کار مسٹر مجیب، حاجی انور کمال، پرویز صدیقی اور افضال احمد صدیقی وغیرہ شامل تھے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو خبرنامہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ادبی خدمات پر سیمینار

● نئی دہلی 30/اکتوبر۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے 82ویں یوم تاسیس تقاریب کے تحت آج شعبۂ اردو کی جانب سے جامعہ کی علمی و ادبی خدمات پر ایک سیمینار منعقد ہوا، جس کا افتتاح کرتے ہوئے جامعہ کے وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے جامعہ کی ادبی تحریک میں جامعہ کے محققین و مفکرین کے ساتھ ساتھ عملی تحریک پر بھی زور دیا۔ سیمنار میں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب اور خواجہ غلام السیدین کی علمی اور ادبی خدمات پر مقالے اور تاثرات پیش کیے گئے۔ پروفیسر سید نقی حسن جعفری نے تجویز پیش کی کہ ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کی کتابوں کو گریجویشن کے نصاب میں شامل کیا جائے۔ صادقہ ذکی نے عظیم صاحب اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی جب کہ پروفیسر عبدالرحمان ہاشمی نے اپنے تاثرات میں جامعہ کو ملک کا لبرل سیکولر ادارہ تسلیم کیا اور اردو ادب میں اس کی خدمات کی تحسین کی۔ سیدہ سیدین نے الہلال اور نئی روشنی سے استفادہ کرکے انگلش میں ایک کتاب مرتب کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ عبداللہ علی بخش قادری نے اپنی تقریر میں ترجمہ کو کتاب لکھنے سے مشکل فن قرار دیا اور کہا کہ ترجمہ نگار کو بھی ادیبوں کی صف میں شامل کیا جانا چاہیے۔ انھوں نے اس موقعے پر عبدالغفار مدھولی کی ادبی خدمات اور بچوں کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین کی ادبی تصنیفات کا تذکرہ کیا۔

دریں اثناء جامعہ اسکول کیمپس میں نہرو ٹرانی کے اسکولی مقابلوں کا انعقاد ہوا جس کا افتتاح روزنامہ راشٹریہ سہارا اردو کے جوائنٹ ایڈیٹر عزیز برنی نے کیا۔ انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو تعلیم و تربیت کے طور طریقوں میں انفرادی حیثیت اور سیکولر سوچ کا حامل ادارہ قرار دیا۔ (قومی آواز، دہلی)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پانچ روزہ قومی ورکشاپ

● نئی دہلی، 5/نومبر۔ اردو خط و کتابت کورس شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام پانچ روزہ قومی ورکشاپ "کمپیوٹر دیب اساس اردو تدریس بذریعہ ہندی اور انگریزی" کا اختتامی اجلاس جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر رفاقت علی خاں کی صدارت میں منعقد ہوا، جس میں مہاتما گاندھی انٹر نیشنل ہندی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر اشوک باجپئی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی عبدالرحمن ہاشمی نے ورکشاپ میں مرتبہ نصاب کا تعارف کراتے ہوئے اس پر اطمینان کا اظہار کیا اور بتایا کہ ورکشاپ کے ماہرین نے ایسا جامع نصاب ترتیب دیا ہے جو عالمی پیمانے پر اردو سیکھنے والوں کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔ مہمان خصوصی اشوک باجپئی نے اپنے مخصوص شگفتہ لہجے میں سامعین کو خطاب کیا اور ہندستانی معاشرے کے تنوع کو زبانوں کے فروغ کے لیے فال نیک قرار دیا۔ ورکشاپ میں پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عتیق احمد صدیقی، پروفیسر شاہ عبدالسلام، پروفیسر نریندر گرگیش اور پروفیسر دی آر جگن ناتھن نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کو آرڈی نیٹر ڈاکٹر خالد محمود نے کہا کہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے توسط سے اردو زبان کو فروغ دینے میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس اردو پیکیج کی تکمیل کا سہرا کمپیوٹر کے ماہرین، ماہرین لسانیات اور شعر و ادب کے اساتذہ پر مشتمل ایک منتخب ٹیم کو جاتا ہے، جس کی مجموعی کوشش اور جدوجہد سے کام کی تکمیل ممکن ہو سکی۔ انھوں نے اردو خط و کتابت کورس کے انسٹرکٹر جناب عبدالرشید اور ان کے کارکنان کا بھی شکریہ ادا کیا جنھوں نے ورکشاپ کو کامیاب بنانے کے لیے جدوجہد کی۔ اختتامی اجلاس میں جامعہ اور دیگر اداروں سے وابستہ اساتذۂ کرام اور ماہرین تعلیم کے علاوہ جامعہ کے طلبہ اور ریسرچ اسکالروں نے خاصی تعداد میں شرکت کی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو یونی ورسٹی کے طلبہ کی تعداد میں سال رواں میں چھیالیس فی صد کا اضافہ

● حیدر آباد، 28/نومبر۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونی ورسٹی کے مختلف کورسیز میں داخلہ حاصل کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اس برس بی اے، بی ایس سی اور بی کام سال اول ڈگری کورس اور دیگر سرٹیفکیٹ پروگراموں میں گذشتہ برس کے مقابلے میں تقریباً 46فی صد سے زائد طلبہ وطالبات نے داخلے حاصل کیے ہیں۔ ان طلبہ کا تعلق ملک کے مختلف حصوں سے ہے۔ یونی ورسٹی کے سب سے مقبول تعلیمی پروگرام، گریجویشن میں گذشتہ برس 4115 طالب علموں نے داخلہ حاصل کیا تھا جبکہ اس برس اس کورس میں داخلہ لینے والوں کی تعداد 5750 ہے۔ تمام کورسیز میں مجموعی طور

پر سال 2001 میں 4345 داخلے ہوئے تھے جو اس برس بڑھ کر 6344 ہو گئے ہیں۔ اسی طرح اسٹڈی سنٹروں کی تعداد بھی پچاس سے بڑھ کر 68 ہو گئی ہے اور ان اسٹڈی سنٹروں کی صورت میں یونی ورسٹی کے مراکز ملک کے 14 صوبوں کے 84 اضلاع میں قائم ہو گئے ہیں۔

اردو یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر شمیم جے راج پوری نے اس بات پر زور دیا کہ یونی ورسٹی حکام اور اردو سے محبت کرنے والے افراد اور اداروں کو کم از کم مزید دس سال تک اردو یونی ورسٹی کے ساتھ ایک تحریک کے طور پر کام کرنا ہوگا۔ اردو ذریعہ تعلیم کے تعلق سے ابھی بے شمار شکوک و شبہات باقی ہیں۔ ان کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو ذریعہ تعلیم کے معیار کو بلند کیا جائے تاکہ یونی ورسٹی سے فارغ طلبہ معاشی طور پر مستحکم ہو سکیں۔ لوگوں کو مادری زبان بالخصوص اردو کی اہمیت سے بھی واقف کرانا ہوگا۔ یونی ورسٹی کو اپنے کورسیز کے انتخاب کے موقعے پر اپنے ٹارگیٹ گروپ کو ہمیشہ ملحوظ رکھنا ہوگا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ یونی ورسٹی میں ملازمت یا روزگار سے مربوط کورسیز شروع کیے جائیں۔ (ڈاک سے)

راجدھانی کے ۲۳ سرکاری اور ۸ غیر سرکاری اسکولوں میں ذریعہ تعلیم اردو

● نئی دہلی، 29 رنومبر۔ سیلم پور اسمبلی حلقے کے ممبر چودھری متین احمد کے ایک سوال کے جواب میں دہلی کے وزیرِ تعلیم مسٹر راج کمار چوہان نے بتایا کہ راجدھانی میں کل 23 اسکول ایسے ہیں جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری امداد سے چلنے والے آٹھ غیر سرکاری اسکولوں میں بھی ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ ان سرکاری اردو اسکولوں میں 152 اور سرکاری امداد سے چلنے والے اردو اسکولوں میں 58 ٹیچروں کی اسامیاں خالی پڑی ہیں۔ انھوں نے ایوان کو اطلاع دی کہ ان اسکولوں کے پرنسپلوں کو حکومت نے ہدایت دی ہے کہ وہ اپنے یہاں گیسٹ ٹیچروں کا بندوبست کریں۔ مسٹر راج کمار چوہان کے مطابق اسسٹنٹ اردو ٹیچروں کا معاملہ عدالت میں زیرِ غور ہے اور عدالت کے فیصلے کے بعد ہی کوئی کارروائی ممکن ہو پائے گی۔ انھوں نے بتایا کہ سرکاری امداد سے چلنے والے اسکولوں میں ٹیچروں کی بھرتی براہِ راست ہوتی ہے۔ مسٹر راج کمار چوہان کے مطابق اردو ذریعہ تعلیم والے سرکاری اسکولوں میں دو جعفر آباد، دو نور نگر، ایک زینت محل، دو جوگا بائی، تین چاندنی چوک، دو لال کنواں، دو جامع مسجد اور دو دریا گنج میں موجود ہیں۔ (قومی آواز، دہلی)

جلسہ تقسیم اسناد

مولانا ابوالکلام آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک، راجستھان

● ٹونک، 20 رنومبر۔ مولانا ابوالکلام آزاد عربک پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک، راجستھان میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ذریعے جاری کمپیوٹر کلاسیز کے بیچ 2002-2001 کے طلبہ و طالبات کے لیے جلسہ تقسیم اسناد منعقد کیا گیا۔ اس تقریب کے مہمانانِ خصوصی عزت مآب اروند مایارام سکریٹری محکمہ آرٹ اینڈ کلچر، حکومت راجستھان اور محترمہ نسیم حسین ڈپٹی سکریٹری محکمہ آرٹ اینڈ کلچر، حکومتِ راجستھان تھے۔ جلسے کی صدارت جناب اشونی بھگت ضلع کلکٹر، ٹونک نے فرمائی۔

اس موقعے پر ادارے کے ڈائرکٹر جناب عبدالمعید خاں نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ادارے کا مختصر تعارف پیش کیا اور اس کی کارکردگی پر روشنی ڈالی اور این سی پی یو ایل کے ذریعے چلائے جا رہے کمپیوٹر کلاسیز کی اہمیت اور ان کی افادیت نیز فارغ شدہ طلبہ و طالبات کی دیگر کمپیوٹر کلاسیز اور کمپیوٹر مراکز میں ملازمت کے حصول اور ان کی خدمات پر بھی مفصل روشنی ڈالی۔

مجلسِ صدارت کے اراکین اور بالخصوص مہمانانِ خصوصی نے 2002-2001 میں کمپیوٹر کلاس میں اول، دوم و سوم پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کو شیلڈ اور سندِ امتیاز سے سرفراز فرمایا۔ کمپیوٹر کلاس کے اس بیچ میں مس معراج سعید نے اول اور شہباز خاں و منہاج الرحمن نے علی الترتیب دوسری اور تیسری پوزیشن حاصل کی ہے۔

جناب اروند مایارام نے اپنی تقریر میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے انسٹی ٹیوٹ میں جاری مذکورہ کمپیوٹر کلاسیز کی کارکردگی کی تعریف کی۔ آخر میں ادارے کے ڈائرکٹر جناب صاحبزادہ عبدالمعید نے مہمانانِ گرامی کی خدمت میں خطاطی کی دلکش و دیدہ زیب وصلیاں پیش کیں۔

اس جلسے کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد ریاض الدین خاں سپروائزر اور انچارج این سی پی یو ایل (کمپیوٹر کلاسیز) نے بہ بخیر و خوبی انجام دیے۔

(ڈاک سے)

مجلسِ ملیہ اسلامیہ کمپیوٹر سنٹر، بنگلور

● بنگلور۔ 22 رنومبر۔ مجلسِ ملیہ اسلامیہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے چلائے جا رہے ایک سالہ کمپیوٹر کورس کی

تکمیل پر تقسیم اسناد کی تقریب بروز جمعرات 21/ نومبر منعقد کی گئی۔ کمپیوٹر کورس کا یہ تیسرا بیچ تھا۔ اب تک کل 150 لڑکیاں کمپیوٹر کورس میں کامیابی حاصل کر چکی ہیں۔ جلسے کی صدارت مجلس ملیہ اسلامیہ کے صدر الحاج مقبول احمد نے کی۔ استقبالیہ تقریر جامع مسجد کے سکریٹری اور سالار پبلی کیشنز ٹرسٹ کے صدر الحاج عتیق احمد اور مہمان خصوصی مولانا ریاض الرحمان نے تمام کامیاب طلبہ کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد آپ کو اس سے معاشی مسئلے حل کرنے میں کافی مدد ملے گی۔ (سالار، بنگلور)

صمدانی کمپیوٹر سنٹر میں دوسرے بیچ کا آغاز

● حیدر آباد، 13/ اکتوبر۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے چلائے جانے والے صمدانی کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سنٹر، عثمان باغ، بہادر پورہ میں مسٹر اختر عالم، ممبر ہائی پاور مانیٹرنگ کمیٹی NCPUL نے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ دور میں کمپیوٹر تعلیم میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کورس کو اور ایڈوانس بنائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ طلبہ اس کورس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کمپیوٹر کی دنیا میں ترقی کر سکیں۔ مسٹر ابہت اروڑہ نے کہا کہ NCPUL کا مقصد اس کورس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار مہیا کرانا ہے۔ مسٹر ونود کمار انچارج کمپیوٹر سنٹر، یونی ورسٹی آف حیدر آباد، مسٹر قادر محی الدین، سنٹر سپر وائزر محبوب حسین جگر کیریر گائیڈنس کمپیوٹر سنٹر، مسٹر محمد عبدالنظیر سنٹر سپر وائزر NCPUL، اردو اکیڈمی کمپیوٹر سنٹر پتھر گٹی برانچ قاضی مسجد فاضل پاشاہ اڈمنسٹریٹیو آفیسر براعم ماڈل اسکول موجود تھے۔ مسٹر سید احمد محی الدین اور مسٹر سید سہیل جاوید فیکلٹی ممبرس نے مخاطب کیا۔ ڈاکٹر لئیق احمد صدیقی نے سنٹر کی مکمل تفصیل بتائی۔

(ڈاک سے)

رضا لائبریری کو ریسرچ ادارہ بنانے کا مطالبہ

● رامپور، 28/ اکتوبر۔ رضا لائبریری کے زیر اہتمام تاریخ پر ہونے والا سہ روزہ نیشنل سیمینار تجاویز پاس کرنے کے بعد ختم ہو گیا۔ تاریخ داں اور اسکالرز نے رضا لائبریری کے رکھ رکھاؤ اور مخطوطات کے تحفظ کی تعریف کی۔ ڈاکٹر آر سی اگروال نے اپنے مقالے میں کہا کہ اکثریت سے مورخین نے سیاسی تاریخ کو زیادہ اہمیت دی ہے جبکہ علی گڑھ اسکول کے مورخین نے سوشیو اکانومک تاریخ کو اہمیت دی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں 11 ویں صدی سے 13 ویں صدی تک لکھی گئی تاریخی کتابوں کا مطالعہ انتہائی توجہ سے کرنا چاہیے۔ انھوں نے ہندی کے عالم رام دھاری سنگھ دنکر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ کسی بھی حکمراں کی کامیابی اور ناکامی میں عوامی ذرائع کے حصے کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے گاؤوں میں جاکر موبائل سیمینار کرنے پر زور دیا۔

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی نے تجویز پیش کی کہ کشمیر کی ثقافتی اور سماجی تاریخ آج تک مرتب نہیں ہوئی ہے جبکہ یہ علاقہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ کشمیر میں دہلی ثقافت کی نمائندگی ہوتی ہے۔ نیز پانی پت اور روہتک وغیرہ بہت زرخیز خطے ہیں۔ ڈاکٹر ایس کے جولی نے تجویز رکھی کہ رامپور رضا لائبریری کو ریسرچ ادارہ بنایا جائے۔ لائبریری سے سینئر اور جونیئر اسکالرز کو دی جانے والی فیلوشپ بڑھا کر آٹھ اور 15 ہزار روپے کی جائے اور البیرونی کے نام سے ایک چیئر قائم کی جائے۔ ابوالفضل کے متعلق تحقیقی کام کرانے کی تجویز بھی پیش کی گئی۔ حافظ سید عرفان علی نے قرارداد پیش کی کہ رضا لائبریری کے اطراف کی عمارات کو بھی لائبریری سے ملحق کر کے قلعے کے دونوں دروازوں کو رضا لائبریری کی تحویل میں لے لینا چاہیے۔ پدم شری امیر حسن عابدی کی تجویز تھی کہ ہندستان کی علاقائی زبانوں میں سیمینار منعقد کیے جائیں۔ انھوں نے کہا کہ آج فرانسیسی اور جرمن زبانیں انگریزی کے مقابلے میں ختم ہوتی جا رہی ہیں اس لیے ہمیں اپنی زبان، تہذیب اور ثقافت کا تحفظ کرنا چاہیے۔ آخر میں رضا لائبریری کے افسر بکار خاص ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی نے شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ تمام تجاویز حکومت ہند کو بھیجی جائیں گی اور درخواست کی جائے گی کہ قلعے کو آثار قدیمہ کے دائرے میں لایا جائے اور قلعے کے حامد گیٹ اور مشرقی گیٹ کو محفوظ کر دیا جائے۔ (راشٹریہ سہارا دہلی)

دھامپور میں اردو کی تدریسی تربیت کا انتظام

● دھامپور، (بجنور) 26/ نومبر۔ "علم و تعلیم کے بغیر زندگی ایک اندھیرا بے مقصد سا سفر ہے اور اندھیرے کا سفر طے کر کے ہی منزل پر وقت پر پہنچا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ تعلیم کی روشنی کو ہر خاص و عام تک پہنچایا جائے۔" ان خیالات کا اظہار شاہ سعود پبلک اسکول کی پرنسپل روشن جہاں آرا نے ایک تقریب کا آغاز کرتے ہوئے کیا۔

تقریب کا مقصد بیان کرتے ہوئے اسکول کے سکریٹری جناب محمد شمیم نے کہا کہ ادارہ شاہ سعود پبلک اسکول دھامپور اپنی تعلیمی خدمات کے

آٹھ برس پورے کر رہا ہے اور اس خوشی کے موقعے پر ادارہ اردو زبان کے ذریعے تدریس کی تربیت لے رہے طلبہ و طالبات کے لیے خصوصی تربیت گاہوں کا آغاز کر رہا ہے جس کا انعقاد 11/دسمبر 2002 کو ہوگا اور ان کلاسوں کے ذریعے ان طلبہ و طالبات کو درس و تدریس کے فرائض انجام دینا سکھایا جائے گا جو جامعہ اردو علی گڑھ سے معلم اردو، تعلیم گھر، لکھنؤ سے یوٹی سی اور دیگر اداروں سے اردو کے ذریعے درس و تدریس کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ تمام ملک میں اردو کے ذریعے جو بھی طلبہ و طالبات درس و تدریس کی ٹریننگ لے رہے ہیں، وہ اپنا رجسٹریشن جلد ہی خود حاضر ہو کر یا ڈاک سے تفصیل روانہ کر کے کرا سکتے ہیں۔ (قومی آواز، دہلی)

اکیسویں صدی میں کمپیوٹر تعلیم کے رول پر سمینار

● کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر فار ویمین حیدر آباد میں "اکیسویں صدی میں کمپیوٹر تعلیم کے رول" کے موضوع پر 20/نومبر 2002 کو ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح جناب ایم اے قدوس، ایڈیشنل سکریٹری، ڈیپارٹمنٹ آف ہائر ایجوکیشن، گورنمنٹ آف آندھرا پردیش اور صدارت جناب جلیل پاشا چیئرمین، آل انڈیا اردو ایجوکیشنل کمیٹی نے کی۔ اس موقعے پر محترمہ وبھا استھان (پرنسپل، سلطان العلوم کالج آف ایجوکیشن)، جناب ایم این کے غوری (آفس انچارج، ساؤتھ انڈیا برانچ، این سی پی یو ایل)، پروفیسر طاہر قادری (مہاراشٹر)، ڈاکٹر شفاعت علی (عادل آباد)، جناب کے پریم راج یادو (مجاہد آزادی)، جناب رئیس اختر (شاعر) اور دیگر مقتدر شخصیات کے علاوہ بڑی تعداد میں سامعین نے شرکت کی۔

اس میں مندرجہ ذیل رزولیوشن پاس کیے گئے:

☆ کمیٹی ریاستی حکومت سے درخواست کرتی ہے کہ وہ تمام تعلیمی اداروں میں (بشمول اردو میڈیم) اپر پرائمری، ہائی اسکول، اقامتی اسکول، جونیئر، ڈگری اور پوسٹ گریجویشن سطح پر کمپیوٹر تعلیم کو لازمی قرار دے۔

☆ اپر پرائمری سے ہائی اسکول سطح تک کمپیوٹر کو ایک لازمی مضمون قرار دیا جائے۔

☆ کمپیوٹر لیب، بنیادی ڈھانچے کی تعمیر، انسٹرکٹروں کی تنخواہ وغیرہ کے لیے حکومت فنڈ فراہم کرائے۔

☆ پورے صوبے میں اسکولوں اور جونیئر و ڈگری کالجوں میں جاب اورینٹیڈ کورس کم از کم فیس پر شروع کیے جائیں۔

☆ سال میں کم از کم ایک بار کمپیوٹر پر سمینار، ورکشاپ اور توسیعی خطبات کا انعقاد تمام سرکاری تعلیمی اداروں میں کیا جائے۔

☆ ایس سی، ایس ٹی اور بی سی کی طرز پر ملک کے تمام اقلیتی طلبہ و طالبات (خصوصاً اردو میڈیم) کو اسکالر شپ دی جائے۔

☆ آئندہ تعلیمی سال میں کمپیوٹر کی تعلیم کے لیے کم از کم 2000 انسٹرکٹر بحال کیے جائیں۔

☆ جن طلبہ و طالبات نے اپنا کورس مکمل کر لیا ہے، ان کی اپرینٹس شپ کا انتظام کیا جائے اور اس کے بعد ان کے لیے روزگار کے مواقع فراہم کرائے جائیں۔ (ڈاک سے)

یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا کے زیر اہتمام "اردو ڈے" کا انعقاد

● نئی دہلی۔ "واقعات اور حالات نے ہمیں اس نتیجے پر پہنچا دیا ہے کہ اردو اب صرف مسلمانوں کی زبان ہے، لہٰذا اس کی آبیاری اور حفاظت دو چند ہو جاتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں گھر کے ہر فرد کو تیار کرنا ہوگا جس میں خواتین کلیدی رول ادا کر سکتی ہیں۔" ان خیالات کا اظہار دہلی کے صوفی سلسلے کی ایک اہم شخصیت خواجہ حسن ثانی نظامی نے غالب اکیڈمی میں "اردو ڈے" تقریب میں کیا۔ یہ تقریب ملک کی سماجی و ثقافتی تنظیم یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا (یو ایم آئی) کی اردو مہم کا حصہ تھی جو 9/نومبر کو علامہ اقبال کے یوم پیدائش پر منعقد کی گئی۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابق پروفیسر، جناب محمد حسن نے اردو کو مادری زبان قرار دیتے ہوئے تقریب کے سامعین میں "نصف بہتر" کی عدم شرکت کا شدت سے احساس دلایا اور اردو کی تباہی میں اردو والوں کی اپنی کوتاہی کو اجاگر کیا۔ اس موقعے پر صحافی معصوم مراد آبادی نے یو ایم آئی کی ملی و ثقافتی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ اس اردو کش دور میں موجودہ تقریب میں لوگوں کی خصوصی دلچسپی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ایک زندہ زبان ہے جسے کوئی مٹا نہیں سکتا۔

ماہنامہ "اردو بک ریویو" کے مدیر عارف اقبال نے سوال اٹھایا کہ اردو نئی نسل کی زبان کیوں کر ہو؟ انھوں نے کہا کہ اب صرف یہی صورت باقی ہے کہ ملک کے تمام ہندی اور انگریزی میڈیم اسکولوں میں اردو اساتذہ کے تقرر کو یقینی بنایا جائے تاکہ ہر طالب علم کم سے کم اردو مضمون کے ذریعے زبان تک رسائی حاصل کر لے۔ عارف اقبال نے یہ بھی کہا کہ نئی نسل کو

اردو سے روشناس کرانے کے لیے والدین کو عزم کرنا ہوگا کہ ان کے بچے ابتدا ہی سے اردو لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں خواہ انھیں ٹیوٹر کیوں نہ رکھنا پڑے۔

اس تقریب میں جناب متین امروہوی اور جناب عبدالرؤف نے علامہ اقبال کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ تقریب کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے صدر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی نے کی۔ تقریب کے اختتام پر یوایم آئی کے کل ہند صدر مولانا برہان الدین قاسمی نے اپنی تنظیم کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس تقریب کے شرکا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ عربی کے صدر ڈاکٹر شفیق احمد ندوی کے علاوہ دیگر علما اور دانشور بھی تھے۔ (ڈاک سے)

یوم آزاد تقریبات

● نئی دہلی، 11 نومبر۔ آزاد ہندستان کے اوّلیں وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کے 114ویں یومِ پیدائش کے موقعے پر آئی سی سی آر کے زیرِ اہتمام آج آزاد بھون میں مولانا آزاد کی زندگی پر مبنی فوٹو نمائش کا دہلی کی وزیرِ اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت نے افتتاح کیا۔ اس موقعے پر آئی سی سی آر کی صدر اور راجیہ سبھا کی ڈپٹی چیئرپرسن نجمہ ہبت اللہ بھی موجود تھیں۔ سیاسی رہنماؤں نے انھیں سرکردہ مجاہدِ آزادی اور 'فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی حوصلہ بخش علامت قرار دیا۔ ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ اور بعض بزرگ شہریوں نے مزارِ آزاد کی گل پوشی کی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

● نئی دہلی: آج اردو اکادمی دہلی کے دفتر میں مولانا ابوالکلام آزاد کے 114ویں یومِ پیدائش کے موقعے پر منعقد ایک خصوصی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اکادمی کے سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بیسویں صدی کی عظیم شخصیت تھی اور وہ اس قدر اہم تھی کہ اس دور کی کوئی ادبی، علمی اور سیاسی تاریخ ایسی نہیں لکھی جاسکتی جس کے اوراق مولانا آزاد کے گوناگوں کارناموں کے ذکر سے خالی رکھے جاسکیں۔ تحریکِ آزادی کے صفِ اوّل کے رہنما اور ہندستان کے پہلے وزیرِ تعلیم مولانا آزاد کی 114ویں سالگرہ نیشنلسٹ کانگریس پارٹی کے صدر دفتر میں منائی گئی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

● جنوبی دہلی میں جامعہ نگر کی فیاضی سنزل میں فرینڈس فار ایجوکیشن کی طرف سے ایک سمپوزیم کا اہتمام کیا گیا جہاں ممتاز شہریوں، اسکالروں اور صحافیوں نے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر جناب فیروز بخت احمد نے کہا کہ ہندستان کو مولانا آزاد جیسے سیاست دانوں کی ضرورت ہے تاکہ ملک کو فرقہ وارانہ رجحانات کے شکنجے سے آزاد کیا جائے کیوں کہ ان رجحانات کی وجہ سے ملک کی مشترکہ تہذیب مٹتی جارہی ہے۔ دارالعلوم دیوبند (وقف) کے شیخ الحدیث مولانا سید انظر شاہ مسعود کشمیری نے کہا کہ مولانا آزاد ویدانتی بصیرت اور وحدتِ دین اور صلح کل پر یقین رکھتے تھے۔ گاندھیائی اسکالر ستاودیا تھن نے کہا کہ بہت بڑے حلقے نے مولانا کو سمجھا ہی نہیں۔ معروف صحافی جناب شاہد صدیقی نے اس بات کا گلہ کیا کہ پنڈت نہرو، مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل کے ساتھ اپنے خوابوں کی ساجھے داری کرنے والے مولانا آزاد کو مرکز میں قائم ہونے والی بعد کی حکومتوں نے نظرانداز کیا اور بھارت رتن سے بھی انھیں پس مرگ نوازا گیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ انتہائی دوراندیش مدبر تھے۔ (قومی آواز، دہلی)

● ہریا تو ہاؤسنگ کالونی (رانچی) میں قومی اردو کونسل کی جانب سے چلائے جارہے یک سالہ ڈپلوما ان کمپیوٹر ایپلی کیشن کے دونوں انسٹی ٹیوٹس کے طلبہ / طالبات نے یومِ آزاد منایا۔ پورا پروگرام اصلاً دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک طلبہ اور دوسرے دانشورانِ شہر کی اہم تقاریر۔ پورے ہندستان میں مجاہدِ آزادی مولانا ابوالکلام آزاد کے کارناموں اور ان کی ہمہ گیر شخصیت پر یومِ آزاد منایا جارہا ہے۔ اسی مناسبت سے یومِ آزاد کے موقعے پر ایک تقریری مقابلہ بعنوان "مولانا آزاد: حیات اور کارنامے" کا انعقاد مرکز ادب و سائنس کی جانب سے کیا گیا۔ جس میں مرکز کے طلبہ / طالبات نے حصہ لیا۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب قیصر ضحی عالم، ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز، رانچی یونی ورسٹی کے علاوہ دیگر مہمانوں میں جناب ڈاکٹر منظر حسین جمشید پور، ابوذر عثمانی شعبۂ اردو، ونوبا بھاوے یونی ورسٹی اور جناب سید جمال اشرف سابق ڈائرکٹر زیویئر انسٹی ٹیوٹ آف سول سروسیز، رانچی (XICS) موجود تھے۔ پروگرام کی صدارت جناب احمد سجاد نے کی۔

پروگرام کا آغاز سنٹر کے انسٹرکٹر حافظ ساجد اقبال کے تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ جناب طارق سجاد نے استقبالیہ تقریر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

استقبالیہ تقریر کے بعد "مولانا ابوالکلام آزاد: حیات اور کارنامے" پر طالب علموں کی جانب سے تقریری مقابلے ہوئے جس میں بحیثیتِ جج سید جمال اشرف صاحب، منظر حسین صاحب اور جناب اشرف عالم خاں موجود تھے۔ مقابلے میں کل آٹھ طلبہ / طالبات نے حصہ لیا۔ اس موقعے پر ابوذر عثمانی صاحب نے بھی مولانا ابوالکلام آزاد کے حالاتِ زندگی میں خصوصاً قومی یکجہتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھیں ہندستان کی ایک عظیم ہستی قرار دیا۔ مقرر کے خیال میں قومی یکجہتی کے معاملے میں مولانا آزاد، جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی اور سردار پٹیل سے بھی اونچے درجے کے

سیاست داں تھے کیوں کہ سب نے ہندستان کی تقسیم کو گوارہ کرلیا لیکن مولانا ابوالکلام آزاد اس کے سخت مخالف رہے اور وہ ہندو مسلم ایکتا پر اٹوٹ یقین رکھتے تھے چنانچہ آخری دم تک قومی یکجہتی کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھا۔

پروفیسر احمد سجاد نے اپنے صدارتی کلمات میں مولانا ابوالکلام آزاد کی کارگزاریوں، ان کے مشن اور حکیمانہ رول پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے تعلیم کے میدان میں خاص طور سے سائنس و ٹیکنالوجی پر خصوصی توجہ صرف کی اور ملک کا تعلیمی نظام اس قدر مضبوط بنیادوں پر مستحکم کیا کہ آج تک اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مسلمانوں کے لیے انھوں نے دینی تعلیم کے ساتھ عصری و سائنسی تعلیم پر کافی زور دیا۔ موصوف نے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ انمٹ ہے۔ (ڈاک سے)

● حیدر آباد، 15/ نومبر۔ کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی و قومی یوم تعلیم کمیٹی کے زیر اہتمام گذشتہ پیر کو مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش پر قومی یوم تعلیم کی تقریب اندرا پریہ درشنی آڈیٹوریم، باغ عامہ، ناملی میں منائی گئی۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی، ایم پی، صدر نشیں کلچرل آفیسر نے افتتاح کیا۔ جناب آر پی وٹھل، سکریٹری فنانس نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ جناب جلیل پاشاہ، صدر نشیں کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی و قومی یوم تعلیم کمیٹی نے صدارت کی۔ (منصف، حیدر آباد)

● ٹانڈہ، رامپور، 11/ نومبر۔ آزاد ہندستان کے پہلے وزیر تعلیم، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے 114ویں یوم پیدائش پر انجمن ترقی اردو اتر پردیش نے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر ایک تقریب مسعود منزل راہ وفا، ٹانڈہ میں انجمن کی صوبائی نائب صدر محترمہ دینا گپتا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ محترمہ دینا گپتا نے کہا کہ 51 سال قبل مولانا آزاد نے صورت حال کی سنگینی کا جو اندازہ لگایا تھا، آج ہندستان ہی نہیں بلکہ دنیا اُسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہے۔ انھوں نے مولانا آزاد کی نمایاں خدمات کی ستائش کی۔ (ڈاک سے)

یوم اقبال

● چھپرہ (بہار)۔ اردو کے بین الاقوامی شاعر اور مفکر علامہ اقبال کے یوم پیدائش پر 9/ نومبر 2002 کو اتحاد کمیٹی کے زیر اہتمام نیشنل میرج ہال، لکڑی بازار (کریم چک) میں بوقت 10 بجے صبح بہ صدارت جناب منظور احمد ایڈووکیٹ (صدر، ضلع سنی وقف بورڈ) "یوم اقبال" منعقد ہوا۔

ماسٹر ابوالکلام بسمل، آرگنائزر نے "شکوہ"، "جواب شکوہ" کے کچھ بند سناکر سامعین سے داد و تحسین وصول کی۔

اتحاد کمیٹی کے صدر جناب سلیم پرویز نے بیرون ملک سے فون پر پروگرام کا افتتاح کرتے ہوئے اقبال کی شاعری کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ جمعیت الانصار کے سکریٹری جناب عبدالقادر نے اقبال کی شاعری میں قرآنی مطالب و مفاہیم پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے منتخب اشعار سنائے۔ جمیعت القریش کے صدر جناب علاء الدین نے اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا۔ آخر میں کمیٹی کے سرپرست بلاغ المبین نے مقررین اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض خورشید ساحل نے ادا کیے۔ (ڈاک سے)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں مغنی ابرحمن کو استقبالیہ

● نئی دہلی، 27/ نومبر۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام اردو کے معروف و ممتاز شاعر پروفیسر مغنی الرحمان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کی اور شہریار نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔

شعبۂ اردو کے صدر قاضی عبیدالرحمان ہاشمی نے مغنی الرحمان کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی تخلیقی فکر کے ارتقائی سفر کا مجملاً جائزہ لیا اور انھیں اردو کا ایک منفرد اور ممتاز تخلیق کار بتایا۔ اس موقعے پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی نے مغنی الرحمان کی انفرادیت اور فنی سرچشموں کے لازوال حسن کا تذکرہ کیا جس کی مثالیں ہمارے عہد میں زیادہ نہیں ملتی ہیں۔ پروفیسر تقی حسین جعفری نے مغنی الرحمان کی بعض نظموں کا انگریزی ترجمہ پیش کیا جنھیں بے حد پسند کیا گیا۔

سید شاہد مہدی نے اپنے دیرینہ تعلقات کے حوالے سے مغنی الرحمان کے ساتھ علی گڑھ میں گزرے ہوئے دنوں کا تذکرہ کیا۔ مغنی الرحمان نے اس موقعے پر اپنے مخصوص انداز میں اپنی چند منتخب نظمیں سنائیں اور ادب دوستوں اور اپنے چاہنے والوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر غیر معمولی مسرت کا اظہار کیا۔

اس موقعے پر اظہار خیال کرنے والوں میں پروفیسر شہریار، فرحت احساس اور ڈاکٹر احمد محفوظ کے نام شامل ہیں۔ (قومی آواز دہلی)

ایک شام ڈاکٹر علیم اللہ حالی کے نام

● کولکتہ۔ انجمن پاسبان ادب راجہ بازار، کولکتہ کی جانب سے معروف شاعر، ادیب اور نقاد پروفیسر علیم اللہ حالی کے اعزاز میں 5/ اکتوبر شام 7 بجے، آزاد نیشنل ہائی اسکول، راجہ بازار، کولکتہ کے ہال میں زیر صدارت کمال جعفری ایک ادبی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں خصوصی طور پر انیس رفیع، ابوذر

ہاشمی، مصطفےٰ اکبر، حکیم محمد سعید شامل ہوئے۔ نظامت امان اللہ ساغر نے انجام دی۔

جلسے کے آغاز میں ڈاکٹر جمیل حیدر شاد (جنرل سکریٹری) نے کہا کہ ڈاکٹر علیم اللہ حالی نہ صرف ملک کی معروف ادبی شخصیت ہیں بلکہ ملک سے باہر بھی اردو کے علمی حلقوں میں پہچانے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر علیم اللہ حالی نے کہا کہ ادب اور تحریک سے شاعر، ادیب یا فنکار متاثر ہوں یا نہ ہوں لیکن وہ عہد ضرور متاثر ہوتا ہے۔ ادب کی تخلیق کے لیے تاریخی معلومات بہت ضروری ہیں۔

انیس رفیع نے افسانوی انداز میں مہمان کا خیر مقدم کیا اور ان کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے اپنے دیرینہ تعلقات کا تذکرہ کیا۔ صدر جلسہ کمال جعفری نے ڈاکٹر حالی کی ادبی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ نہ صرف ایک اعلیٰ پائے کے شاعر وادیب ہیں بلکہ ایک اچھے نقاد بھی ہیں جو تنقیدی پہلو کو کم، اصلاحی پہلو کو زیادہ اجاگر کرتے ہیں جس سے شاعر وادیب کو بڑی تقویت پہنچتی ہے۔ بعد ازاں خان شمین کنور نے افسانہ "خیال خیال زندگی" اور ضیاء القمر نے "ہوا بھی ہوگئی شامل دیے جلانے میں" پیش کیا۔ پھر مشاعرہ شروع ہوا، جس میں درج ذیل شعرا کرام نے اپنی غزلوں سے سامعین کو محظوظ کیا: کمال جعفری، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ابوذر ہاشمی، حلیم صابر، فصیح احمد ساحر، ممتاز غازی پوری، مصطفےٰ اکبر، ڈاکٹر جمیل حیدر شاد، امان اللہ ساغر، اکبر قاسم، اشرف یعقوبی، فاروق قیصر، شفیق الدین شایاں، یوسف اختر، عرفان رشید، ودود عالم آفاقی اور سعید فیضی وغیرہ۔ (اخبار مشرق، کلکتہ)

مشاعرے

● نئی دہلی، 30/اکتوبر۔ بستی حضرت نظام الدین میں واقع غالب اکیڈمی میں گذشتہ روز مولانا ابوالکلام آزاد ویلفیئر اینڈ لٹریری سوسائٹی کے زیر اہتمام رمز آفاقی کی یاد میں ایک شعری وادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں دہلی کے وزیر خوراک و دہلی وقف بورڈ کے چیئرمین ہارون یوسف، دہلی حج کمیٹی کے چیئرمین عبدالسمیع سلمانی، ڈاکٹر سید محمد فاروق، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، معین اختر انصاری، محمد اسلم خاں سمیت متعدد ادبی و سماجی شخصیات نے شرکت کی۔

اس موقعے پر شمس رمزی کے مرتب کردہ رمز آفاقی (مرحوم) کے شعری مجموعے "کائنات در کائنات" اور شمس رمزی کی تنقیدی کتاب "آئینہ در آئینہ"، شاد فدائی کے شعری مجموعے "آواز کی لکیریں"، حاصل سنبھلی کے شعری مجموعے "منزل بہ منزل" اور شمس رمزی کی مرتب کردہ ایک اور کتاب "کفیل آزر: فن اور شخصیت" کا اجرا کیا گیا۔ کفیل آزر کو پہلے رمز آفاقی ایوارڈ اور افتخار سخن کے خطاب سے سرفراز کیا گیا۔

اس موقعے پر ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے رمز آفاقی کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھیں صدی کا اہم عروض داں اور شاعر قرار دیا۔ اس کے بعد ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کے کنوینر صالحین فہمی اور چیئرمین شہباز ندیم ضیائی تھے۔ مشاعرے کی صدارت الحاج محمد اسلم خاں نے کی جب کہ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ وقار مانوی، حاصل سنبھلی، شاد فدائی، شہباز ندیم ضیائی، ڈاکٹر تابش مہدی، فاروق ارگلی، ڈاکٹر انجمن آرا انجم، افضل کرتپوری، مخدوم زادہ مختار عثمانی، سرویش چندوسوی، سلیم صدیقی، اعجاز انصاری، سیف سحری نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

● چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی، میرٹھ کے راجہ مہندر پرتاپ سنگھ آڈیٹوریم میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح حکومتِ اترپردیش کے اقلیتی فلاح اور حج کے وزیر محترم حاجی یعقوب قریشی نے کیا۔

مشاعرے کی صدارت کرتے ہوئے شیخ الجامعہ پروفیسر رمیش چندرا نے شعبۂ اردو کی سرگرمیوں پر خوشی کا اظہار کیا۔

مشاعرہ دن میں تین بجے شروع ہوا، نظامت کے فرائض طالب زیدی اور معین شاداب نے انجام دیے، شیخ الجامعہ کے چلے جانے کے بعد مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر مضطر نگینوی نے کی۔ مشاعرے میں امیت بھارتی اہنت، رخسانہ عثمانی، پرویز میرٹھی، نظیر میرٹھی، مدہوش میرٹھی، ڈاکٹر وجے ورماہنر، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، مضطر نگینوی کے علاوہ اسرار الحق اسرار (کھتور) عدیل تابش (کرتپور) عبداللہ راہی (دیوبند) ڈاکٹر نگار عظیم (دہلی) اقبال اشہر (دہلی) معین شاداب (دہلی) نے مشاعرے کو رونق بخشی۔ (ڈاک سے)

● جے پور، 29/اکتوبر۔ جے پور میونسپل کمیٹی کی جانب سے جشنِ جے پور کے تحت چیمبر آف کامرس میں منعقد مشاعرے میں مختلف شعرا نے اپنے کلام سے نوازا۔ مشاعرہ کامیابی کے ساتھ دیر رات تک چلا۔ مہمانِ خصوصی ایم پی گردھاری لال بھارگو تھے۔ جن شعرا کا کلام پسند کیا گیا ان کے نام پیش کیے جارہے ہیں۔ حنا تیموری، سید مہدی جعفری، ممتاز نسیم، عزم شاکری، رئیس نظامی، وکیشت دان گوری، عادل لکھنوی، ڈاکٹر زینت کیفی۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

● جدہ، باشندگانِ دکن کی سماجی تنظیم "دکن سوشیل اینڈ ویلفیر فورم جدہ" کے جشنِ تاسیس کے موقعے پر یکم نومبر کو منعقدہ مشاعرہ 2002 میں

جدہ میں مقیم دو درجن سے زیادہ ہندوپاک کے شاعروں نے مختلف اصنافِ سخن میں اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا اور تقریباً 500 باذوق خواتین و حضرات سے داد و تحسین حاصل کی۔

قلب شہر میں واقع چلینٹ پلوٹو سنٹر ہال میں محفل شعر و سخن کی کارروائی کا آغاز فورم کے مشیر اعلیٰ جناب شریف اسلم کی خیر مقدمی تقریر سے ہوا۔ اس کے بعد جدہ کے نامور ناظم مشاعرہ جناب احمد سعود قاسمی نے سب سے پہلے ممتاز عالم دین و ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ مولانا عبداللہ عباس ندوی سے صدارت کی درخواست کی جس کے فوری بعد مشاعرے کی کارروائی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس کے بعد شہ نشین پر عالم عرب سے شائع ہونے والے پہلے اردو جریدے، اردو نیوز اور اردو میگزین کے ایڈیٹر انچیف محمد غراب، احمد الدین اویسی، محمد طارق غازی اور فضل محمد اکرام یکے بعد دیگرے بحیثیت مہمانانِ خصوصی تشریف لائے۔ دکن سوشیل اینڈ ویلفیر فورم کے بانی و جنرل سکریٹری محمد یوسف الدین امجد نے تعارفی تقریر کی۔ فورم کے سرپرستِ اعلیٰ ڈاکٹر سید علی محمود (کنگ عبدالعزیز یونی ورسٹی) نے زبانِ اردو کی قبولیتِ عام کا حوالہ دیتے ہوئے مشاعروں کی اہمیت و افادیت کا ذکر کیا۔ اس مشاعرے میں کلام سنانے والے ہندوپاک کے شعرائے کرام کے اسمائے گرامی ہیں:

احمد سعود قاسمی، محمد اسد خاں، مسرت حسین قریشی، زمرد خاں سیفی، نظر مجازی، عبدالقیوم واثق، امجد بلوچ، حبیب صدیقی، محسن علوی، طارق ہاشمی، سید قمر حیدر قمر، نسیم سحر، عبدالباری انجم، ظفر مہدی، نعیم حامد علی، احمد عطا اللہ فاروقی، ارمان نجمی، نوید افروز، مہتاب قدر، منور النساء منور، عرفان بارہ بنکوی، اطہر نفیس عباسی، محمد طارق غازی اور نعیم جاوید۔

مشاعرے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ 'اردو نیوز' کے ایڈیٹر ان چیف جناب محمد غراب نے سامعین کو اردو عربی کے ملے جلے لہجے میں بہ زبانِ اردو مخاطب کیا اور اپنے چند پسندیدہ اشعار بھی سنا کر خوب داد پائی۔

(سیاست، حیدرآباد)

کتابوں کا اجرا

جانباز شہزادے

● کامٹی ضلع ناگپور: بچوں کے لیے جناب وکیل نجیب کی دسویں تصنیف "جانباز شہزادے" کا اجرا محمد علی گنج کامٹی میں ریاستی وزیر محترمہ سلیکھا تائی کمھارے کے ہاتھوں انجام پایا۔ جلسے کی صدارت بابا تائی چورے، صدر بلدیہ، کامٹی نے کی۔ ناگپور ضلع کانگریس کے صدر شیخ حسین صاحب، دلت مترشری رام بوہریا جی، نصرت کمال انصاری کونسلر، جناب مظفر سعید افروز اور جناب محمود الحسن نے بحیثیت مہمانانِ خصوصی شرکت کی۔ اس موقعے پر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے نئے منتخب شدہ اراکین کرن دھوڑ صاحبہ اور محترمہ شبنم خاں شبنم کا استقبال کیا گیا۔

جلسے کا آغاز سراج احمد صاحب نے تلاوتِ کلام پاک سے کیا۔ محمد حسین عارف اور توحید الحق انصاری نے بارگاہِ رسالت مآب میں نذرانۂ نعت پیش کیا۔ جناب الیاس صدیقی نے وکیل نجیب کی ناول نگاری پر اپنا مقالہ، ڈاکٹر اشفاق احمد نے خاکہ پیش کیا۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے ادبِ اطفال میں وکیل نجیب کے کاموں کا ذکر کیا اور پورے خطے میں انہماک سے بچوں کے ادب پر مسلسل کام کرنے کے لیے اُن کو مبارکباد پیش کی۔

عادل علمی مرکز کامٹی، تکیہ محبوب شاہ ایکشن کمیٹی مومن پورہ، تعمیر ہاؤسنگ سوسائٹی، اسلامیہ ہائی اسکول کے علاوہ مختلف اداروں کی جانب سے جناب وکیل نجیب کا استقبال کیا گیا۔

اجرا کے جلسے کے بعد کامٹی کے بزرگ شاعر حضرت کیفی اسماعیلی کامٹوی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا جس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر الیاس صدیقی مالیگانوی اور جناب کلیم احمد ناگپوری نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

اپنا مرثیہ

● انجمن ترقیِ اردو، ویشالی کے زیرِ اہتمام 4 رنومبر 2002 کو ذکی احمد کی تصنیف "اپنا مرثیہ" کی رسم اجرا مقامی انجمن فلاح المسلمین، حاجی پور کے ہال میں انجام دی گئی۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر ممتاز احمد خاں اور صدارت پروفیسر نجم الہدیٰ سابق صدر شعبۂ اردو بہار یونی ورسٹی، مظفرپور نے کی۔

جلسے کا آغاز مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کی تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ مناظر حسن آزاد نے نظم "نذرِ ذکی" پیش کی۔ جلسے میں جناب ذکی احمد کی شخصیت اور شاعری پر پانچ مقالے پڑھے گئے۔ مقالہ نگار حضرات تھے: پروفیسر مشتاق احمد (حاجی پور)، جناب انوار الحسن وسطوی، سید مصباح الدین احمد، مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں۔ جناب ذکی احمد نے اپنی تصنیف کی رسم اجرا انجام دینے پر انجمن کا شکریہ ادا کیا۔

پروفیسر نجم الہدیٰ نے "اپنا مرثیہ" کی رسم اجرا انجام دی اور کہا کہ جناب ذکی احمد ایک کہنہ مشق شاعر ہونے کے باوجود اسی طرح غیر معروف یا کم معروف رہے جیسے اس سرزمین کے بہت سے جوہر قابل ہنوز دیدہ وروں کی نگاہ سے اوجھل ہیں۔ ڈاکٹر ریحان غنی (پٹنہ)، سید اسمٰعیل حسنین نقوی (پٹنہ)، جناب واحد نظیر (پٹنہ) اور جناب محمد خلیل (لعل گنج) نے بھی اس موقعے پر ذکی صاحب کی شخصیت اور شاعری پر اظہار خیال کیا۔ انجمن کے

نائب صدر جناب ظہیر نوری کے شکریے پر سمینار اختتام پذیر ہوا۔
(ڈاک سے)

مناظر نامہ

● دربھنگہ، 3 رنومبر 2002 کو اردو ادبی سرکل، قلعہ گھاٹ، دربھنگہ کے زیر اہتمام پروفیسر عبدالمنان طرزی کی کتاب "مناظر نامہ" کا اجرا ایل این متھلا یونی ورسٹی کے ڈاکٹر ول کمار کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر اجیر الحق اور نظامت ڈاکٹر امام اعظم نے کی۔

جلسے کی شروعات پروفیسر طرزی کی تلاوت کلام پاک سے ہوئی۔ اس سے پہلے ڈاکٹر شاہد ظفر نے مہمانِ خصوصی، صدر اور صاحبِ کتاب کی گلپوشی کی۔ ڈاکٹر امام اعظم نے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر ول کمار کی خدمت میں ایک استقبالیہ نظم پیش کی۔ "مناظر نامہ" پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر شارق خلیق نے ڈاکٹر طرزی اور ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے کارناموں پر روشنی ڈالی اور ڈاکٹر طرزی نے جس انداز سے ڈاکٹر ہرگانوی کی ہمہ جہت شخصیت کا منظوم جائزہ لیا ہے اس کے لیے شاعر کو مبارک باد پیش کی۔ سابق اے ڈی ایم نیاز احمد نے اپنے خیالات انگریزی زبان میں پیش کیے اور ڈاکٹر ہرگانوی کی ادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ایم نہال، ڈاکٹر امام اعظم، ادریس پرویز ایڈووکیٹ اور پروفیسر ایل پی سنگھ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اخیر میں ایک مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں پروفیسر شاکر خلیق، پروفیسر ایم کمال الدین، پروفیسر عبدالمنان طرزی، شنکر پریلامی، حسن امام درد، نیاز احمد، ڈاکٹر امام اعظم، ڈاکٹر منصور عمر، امتیاز احمد صبا، حیدر وارثی وغیرہ نے اپنے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● بنگلور، 6 رنومبر۔ گورنمنٹ اردو پرائمری اسکول بلاک ہلی نزد کمبل پوش، بنگلور میں آج منعقدہ بنگلور نارتھ اردو پرائمری مدارس کے اجلاس میں کرناٹک راجیہ اردو ٹیچرس اسوسی ایشن (کراٹا) کی جانب سے ریاستی وزیر برائے چھوٹی صنعت وامور حج جناب آر روشن بیگ اور فنکارانِ اردو انجمن کے صدر جناب ایس آر خاں کو اردو خدمت کے اعتراف میں اور جناب منیر احمد سینئر رپورٹر روزنامہ سالار اور جناب رضوان اللہ خاں سب ایڈیٹر و رپورٹر روزنامہ سیاست کو اردو صحافتی خدمت کے اعتراف میں اعزاز سے نوازا گیا۔ (سالار، بنگلور)

● نئی دہلی، 20 رنومبر۔ گذشتہ روز تال کٹورہ اسٹیڈیم میں سروودیہ بال ودیالیہ نمبر 1 جامع مسجد، دہلی کو وزیر اعلا قومی خطہ راجدھانی، دہلی محترمہ شیلا دکشت کے مبارک ہاتھوں سے زون نمبر 27 کا بہترین اسکول اندرا ایوارڈ دیا گیا۔ یہ اسکول اپنی دیرینہ روایات کے مطابق بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔ چنانچہ تعلیمی سال 2002-2001 میں بورڈ کے سیکنڈری امتحان میں تنویر احمد چودھری نے 69 فیصد نمبر حاصل کیے اور اندرا ایوارڈ پایا۔

بحیثیتِ مجموعی اسکول ہٰذا کا سینئر سیکنڈری کا نتیجہ، کامرس صد فی صد، آرٹس صد فی صد اور سائنس 67 فی صد رہا جب کہ سیکنڈری امتحان کا نتیجہ 74 فی صد رہا۔ تقریب میں اسکول کے پرنسپل فیروز خاں کی منصوبہ بند کوششوں اور اساتذہ کی مشترکہ کاوشوں کو سراہا گیا۔ (قومی آواز، دہلی)

● ممبئی، 22 راکتوبر۔ گذشتہ دنوں انجمن تبلیغ اسلام ہائی اسکول، کرلا کے اساتذہ نے مشہور ڈراما نگار اقبال نیازی کے اعزاز میں ایک تہنیتی جلسے کا انعقاد اسکول ہال میں کیا۔ جس کی صدارت وزیرِ مملکت حکومتِ مہاراشٹر جناب نواب ملک نے کی اور نظامت کے فرائض حامد اقبال صدیقی نے انجام دیے اور مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب ساجد رشید، انور قمر، مقدر حمید، ڈاکٹر عبداللہ شیخ، مبارک کاپڑی، انصاری محمود پرویز نے شرکت کی اور جناب اقبال نیازی کے فن اور شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہ جلسہ محترم اقبال نیازی کو اردو ڈراما سرگرمیوں کے لیے سردار جعفری ایوارڈ حاصل کرنے کے اعزاز میں منعقد کیا گیا۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

نونہال آتے ہیں ارتھی کو کنارے کرلو
میں جہاں تھا انھیں جانا ہے وہاں سے آگے
آسماں ان کا، زمیں ان کی، زمانہ ان کا
ہیں کئی ان کے جہاں میرے جہاں سے آگے
انھیں کلیاں نہ کہو ہیں یہ چمن ساز سنو

یہ اشعار جن سے اردو کے مشہور ترقی پسند شاعر کیفی اعظمی کے نظریۂ حیات کی ترجمانی ہوتی ہے اور زندگی و مستقبل میں ان کے یقین کے عکاس ہیں، یکم جون 2002 کو جرمنی کے دارالحکومت برلن میں گونج رہے تھے، جب اردو انجمن برلن کی جانب سے ایک تعزیتی جلسے کا اہتمام کیفی اعظمی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔

تعزیتی جلسے کا آغاز ٹیلی سیریل "مرزا غالب" میں لکھے گئے کیفی اعظمی کے مکالمے سے کیا گیا۔ اس سے قبل ہائنرش بوئیل فاؤنڈیشن کے نمائندے یوسٹ پاشکی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے جلسے میں موجود جرمن،

ہندستانی، پاکستانی اور دیگر ملکوں کے لوگوں کو خوش آمدید کہا اور ایک جرمن فنکار ہلال نے ستار پر دردناک دھن پیش کی اور حاضرین نے کھڑے ہو کر دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ کیفی اعظمی کو خراج عقیدت پیش کیا۔

اردو انجمن کے صدر عارف نقوی نے کیفی اعظمی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ترقی پسند شاعر تھے مگر انھوں نے ادب کو نعرے بازی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ عارف نقوی نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ پچھلے برسوں میں شاعروں اور مصنفوں کی ایک پوری نسل آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کی طرح ہمیں راہ دکھا کر خود روپوش ہو گئی ہے جس سے ترقی پسند ادب ہی نہیں برِ اعظم کی ساری ادبی زندگی میں ایک زبردست خلا پیدا ہو گیا ہے۔

اسلام آباد یونی ورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر اسلم سید نے کیفی اعظمی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ترقی پسند ادبی تحریک کی اہمیت پر زور دیا اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ادب کو مذہب اور فرقوں کے دائروں میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔

اردو انجمن، برلن کی نائب صدر محترمہ یغینارو باتکانے کیفی اعظمی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ کیفی نے پسماندہ عوام کے لیے جدوجہد کی تھی۔ جلسے میں لندن میں مقیم ادیب ڈاکٹر ودیا ساگر آنند کا پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا جس میں انھوں نے کیفی اعظمی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کیفی اعظمی ان روشن خیال شخصیتوں میں سے تھے جنھوں نے بڑھتے ہوئے مذہبی جنون کا مقابلہ اپنی نظموں، فلمی گیتوں اور فلمی کہانیوں سے کیا۔

تعزیتی جلسے میں شعری نشست کا آغاز عارف نقوی کی تازہ نظم، "کیفی اعظمی کو سلام" سے ہوا۔ اس کے بعد دھیرج رائے نے ایک بنگالی نظم پیش کی۔ محترمہ بشریٰ ملک نے جو شہر ایرفورٹ سے شرکت کے لیے تشریف لائی تھیں، نیز مقامی شاعر سرور، ظہیر اور شکیل چغتائی نے اپنی غزلیں اور نظمیں پیش کیں۔ فری یونی ورسٹی برلن کی ایرانی استانی محترمہ فریفتہ توکلی نے فارسی زبان میں کلام پیش کیا۔

جلسے کا اختتام فلم "مرزا غالب" سے کیا گیا جس کے مکالموں کو حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ (ڈاک سے)

● علی گڑھ، 20 رنومبر۔ اردو کے ممتاز شاعر جون ایلیا اور مشہور افسانہ نگار سریندر پرکاش کے انتقال پر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا، جس کے آغاز میں صدر شعبہ پروفیسر قیصر جہاں نے اپنے تاثرات بیان کیے۔ جون ایلیا اور سریندر پرکاش دونوں ہی 1930 میں پیدا ہوئے تھے اور دونوں کا انتقال بھی ساتھ ہی ساتھ ہوا۔ ایک نے ہندستان سے کراچی ہجرت کی تو دوسرے نے پاکستان چھوڑ کر ہندستان کو اپنا وطن بنایا۔ ہندستان کی مٹی سے دونوں کو محبت تھی۔ جون ایلیا نے اپنی شاعری میں اس کا اظہار کیا اور سریندر پرکاش کے افسانوں میں اس محبت کا رنگ دیکھا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید احمد نے کہا کہ 1989 میں ایلیا ہندستان آئے تو اپنے وطن امروہہ کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے بے اختیار ہو کر زمین پر لوٹنے لگے۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے اور ناصر کاظمی کی رومانیت کے خلاف جن شعرا نے ردِ عمل کا اظہار کیا، ان میں سلیم احمد، ظفر اقبال اور ساقی فاروقی کے ساتھ جون ایلیا کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن بڑا فرق یہ ہے کہ ان تینوں شعرا نے اپنے تجربات کا اظہار علامتوں اور پیکروں کے ذریعے کیا جبکہ جون ایلیا نے راست اور بے تکلف انداز بیان اختیار کیا تاہم غزل کی ایمائیت اور شعریت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ ایلیا کے غزلیاتی آہنگ میں ایک طرح کی تندی و تلخی ہے جو یگانہ کے لہجے کی یاد دلاتی ہے۔ سریندر پرکاش کے انتقال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر قاضی افضال حسین نے کہا کہ سریندر پرکاش 17 برس کی عمر میں تقسیم ہند کے بعد پاکستان سے ہندستان آگئے۔ ابتدائی زندگی انھوں نے عسرت اور تنگی میں گزاری۔ اخیر زمانے میں ان کا قیام ممبئی میں تھا جہاں وہ کچھ دنوں فلم انڈسٹری سے بھی وابستہ رہے۔ افسانہ نگاری کے فن میں سریندر پرکاش کے امتیازات پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر قاضی جمال حسین نے ان کی بعض کہانیوں کا خصوصیت سے ذکر کیا۔ "دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم"، "قلقار مس" اور "بجوکا" ایسی کہانیاں ہیں جو اپنی معنوی تہہ داری اور غیر معمولی فنکاری کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ان کی کہانیاں کسی ایک وقت یا زمانے میں محدود ہو نہ رہ کر وقت کی روایتی پابندیوں سے بہت بلند ہو جاتی ہیں۔ سریندر پرکاش کی رحلت ایک بڑا ادبی سانحہ ہے جس کی تلافی کے مستقبل قریب میں امکانات نظر نہیں آتے۔ اخیر میں جون ایلیا اور سریندر پرکاش کی وفات پر تعزیتی قرار داد پیش کی گئی اور دو منٹ کی خاموشی کے بعد جلسہ ختم ہوا۔

● نئی دہلی، 12 رنومبر۔ اردو کے ممتاز جدید افسانہ نگار سریندر پرکاش کے انتقال پر دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں تعزیتی جلسہ صدر شعبۂ اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدر شعبہ پروفیسر صادق نے کہا کہ اردو افسانے کو نئے تجربات سے روشناس کرانے والوں میں سریندر پرکاش کا نام ممتاز ہے۔ ڈاکٹر شریف احمد نے کہا کہ افسانوں میں علامت کا جو بلیغ اور بھرپور استعمال سریندر پرکاش نے کیا ہے، وہ ہمارے یہاں کم دیکھنے میں آتا ہے۔

پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ سریندر پرکاش کی علامتی تہوں میں معاشرتی مسائل کا کرب پوشیدہ ہے۔ پروفیسر امیر عارفی نے سریندر پرکاش کو سیاسی معاشی اور معاشرتی مسائل کو در پردہ بے نقاب کرنے والا افسانہ نگار قرار دیا۔ پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ سریندر پرکاش کا تعلق بلراج مین را، الیاس احمد گدی اور جوگندر پال وغیرہ کی نسل سے ہے جس نے جدید افسانے کو کئی نئی جہات سے آشنا کرایا تھا۔ ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ سریندر پرکاش جدید افسانے کے بنیاد گزاروں میں تھے۔ اس اعتبار سے ان کی شخصیت ایک مستقل اور اہم باب کی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

● میرٹھ، 23/نومبر۔ چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کی تنظیم "بزمِ اردو" کے زیرِ اہتمام جون ایلیا، سریندر پرکاش اور جعفر عباس کی یاد میں ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد عمل میں آیا۔ جلسے کی صدارت صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر نیّر جہاں نے انجام دیے۔

جلسے کا آغاز ایم اے پروفیشنل اردو کے طالب علم سعید احمد کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نیّر جہاں نے تینوں حضرات کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اس موقعے پر کہا کہ جون ایلیا ہمارے عہد کے بڑے شاعر ہیں۔ آپ کی شاعری میں عام انسان کا درد، ہجرت کا کرب اور اپنے وطن سے محبت کی خوشبو ملتی ہے۔ سریندر پرکاش عہد جدید کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ جدیدیت کے علم بردار افسانہ نگاروں میں آپ کا منفرد مقام ہے۔ جعفر عباس اردو کے منفرد صحافی، مزاح نگار اور ترجمہ نگار ہیں۔ نئی دنیا میں "آئینہ" اور عوام میں "جام بکف" آپ کے بہت مشہور کالم ہیں۔ ان تینوں حضرات کا انتقال اردو کا بڑا نقصان ہے۔

آخر میں ڈاکٹر نیّر جہاں نے تعزیتی قرارداد پیش کی اور بزمِ اردو کے سکریٹری کنور محمد یونس نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ (قومی آواز، دہلی)

● لکھنؤ، 11/نومبر 2002۔ آل انڈیا مجروح اکیڈمی کا ایک تعزیتی جلسہ جون ایلیا کے سانحۂ ارتحال پر دفتر ماہنامہ "امکان" لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر اشفاق محمد خاں نے کہا کہ "جون ایلیا کے انتقال سے اگر ایک طرف اردو شاعری کو نقصان پہنچا ہے تو دوسری طرف عالمی مشاعرے بھی ایک ایسی طرحدار شخصیت سے محروم ہوئے ہیں جو سامعین کے دلوں میں اپنی جگہ بنائے ہوئے تھی۔" ماہنامہ "امکان" کے نائب مدیر پرویز ملک زادہ نے کہا "یوں تو کوئی بھی صنفِ سخن ان پر بند نہیں تھی لیکن خصوصیت کے ساتھ ان کے جمالیاتی اور مکالماتی قطعات اور عام فہم زبان میں کہی ہوئی غزلیں سامعین اور قارئین کے دلوں کو جیت لیتی تھیں"۔ مجروح اکیڈمی کے کنوینر محمد شعیب نے کہا کہ جون ایلیا صرف اپنے ہی ملک میں نہیں دنیا کے مختلف ممالک میں اپنی شاعری اور اپنے اخلاق کے حوالے سے کافی ہر دلعزیز تھے۔ ان کے انتقال سے شعر و ادب کی تقریبات سونی ہو گئی ہیں۔

اس موقعے پر آفاق الماس، شاہینہ آفاق، شلپانہ سلمان اور دیگر حاضرین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ (ڈاک سے)

● امروہہ، 12/نومبر۔ جون ایلیا کی ناگہانی موت پر ان کے وطن امروہہ میں مختلف مقامات پر تعزیتی نشستیں منعقد کی گئیں۔ "بزمِ رئیس"، "بزمِ حیات" اور "حلقہ اربابِ ذوق" کی الگ الگ نشستوں میں مرحوم جون ایلیا کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے مقررین نے ان کی شاعری پر اظہارِ خیال کے ساتھ ان کی زندگی کے دلچسپ واقعات اور ان کی شخصیت کے مخفی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ ثروت چلڈرن ہوم میں "جنوادی لیکھک سنگھ امروہہ" کی جانب سے منعقد نشست میں سرفراز عثمانی نے کہا کہ جون ایلیا کی آخری حسرت اپنے وطن میں مدفون ہونے کی تھی جس کا اظہار انھوں نے بیشتر مواقع پر کیا تھا۔ اگر بھارت پاکستان کے بارڈر کھلے ہوتے تو جون ایلیا اپنی زندگی کے آخری ایام یقیناً اپنے وطن امروہہ میں ہی گزارنا پسند کرتے مگر ان کی یہ خواہش ادھوری ہی رہ گئی۔ سرفراز عثمانی نے کہا کہ اپنے وطن سے بچھڑنے کا غم کیا ہوتا ہے یہ جون ایلیا کی شاعری کے مطالعے سے جانا جا سکتا ہے۔ اشرف المساجد شفاعت پوتا کے امام اور مرحوم جون ایلیا کے شاگردِ رشید مولانا سید محمد سیادت نے کہا کہ امروہہ سے پاکستان گئے لوگوں میں جون ایلیا قابلِ فخر امروہہ والوں کی آخری کڑی تھے۔ ان کی ناگہانی موت ہم سبھی لوگوں کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے جس کا اندازہ صرف وہی کر سکتے ہیں جنھوں نے ان کو پاس سے دیکھا اور جانا تھا۔

اس موقعے پر طرب ضیائی، ڈاکٹر شفاعت فہیم، شوق امروہوی، بمشید کمال، لاڈلے، سبطِ سجاد، مولانا سردش، رشید نقوی، ندیم عرشی، شمیم امروہوی وغیرہ موجود تھے۔

انجمن جاں نثارانِ حسین امروہہ کی بھی ایک میٹنگ نواب انتقام علی کے زیرِ صدارت ہوئی جس میں ڈاکٹر عظیم امروہوی نے جون ایلیا کی شاعری پر تفصیلی گفتگو کی۔ صدر انجمن شاہد حسین نے کہا کہ جون ایلیا نہ صرف شاعری بلکہ لسانیات کے بھی ماہر تھے اور زبان کا ایسا علم رکھتے تھے کہ جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مشہور افسانہ نگار رئیس نجمی نے کہا کہ جون میرے بچپن کے دوست تھے اور ابتدا سے ہی غیر معمولی صلاحیت اور ذہانت کے مالک تھے۔ قیس کمال نے کہا جون ایلیا ہندستان اور خاص طور سے اپنے وطن امروہہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ سکریٹری انجمن سید محمد نقی نے کہا کہ جون ایلیا نے

1993 میں انجمن کے حسین ڈے میں شرکت کی تھی اور اس کے لیے انھوں نے خاص طور سے ویزے کی میعاد بڑھوائی تھی۔ صدر جلسہ نے جون ایلیا کی موت کو پوری اردو دنیا کا نقصان بتایا۔

سرسی میں "بزم شعرائے شیم" اور "بزم فروغ ادب" کی مشترکہ تعزیتی میٹنگ بر مکان امیر حسن کھنڈ ساری منعقد کی گئی جس میں شبوبی سرسوی، محمد رضا، معروف سرسوی، ثامن سرسوی، سحر اختر، فلک سرسوی، مجمی سرسوی، ندیم اصغر، معراج سرسوی، ظہیر انور، انقلاب سرسوی وغیرہ نے کہا کہ جون ایلیا صاحب طرز شاعر ہونے کے ساتھ ماہر لسانیات بھی تھے۔ ان کی موت اردو کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ تعزیتی میٹنگ کی صدارت رضا سرسوی نے کی۔ نظامت کے فرائض تیر سرسوی نے انجام دیے۔ اس کے بعد مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔

(راشٹریہ سہارا دہلی)

● نئی دہلی، 22 نومبر۔ دفتر ماہنامہ "پاکیزہ آنچل" جنگ پورہ میں شاعر و مزاح نگار، مترجم، ادیب اور صحافی سید جعفر عباس کے سانحۂ ارتحال پر ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جلسے کی صدارت خالد مصطفیٰ صدیقی نے کی اور نظامت کے فرائض طالب رامپوری نے انجام دیے۔ اس تعزیتی جلسے میں "پاکیزہ آنچل"، "مہکتا آنچل" اور "خوب صورت انداز" کے اسٹاف نے شرکت کی اور مرحوم کو خراج عقیدت پیش کر کے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ خالد مصطفیٰ صدیقی نے جعفر عباس کی شخصیت کے کئی پہلو اجاگر کیے، جن میں مرحوم کے حسنِ اخلاق اور نرم مزاجی کا ذکر خاص تھا۔ انھوں نے کہا کہ جعفر عباس جیسی انسان دوست علمی شخصیات بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ جعفر عباس جتنے بڑے قلم کار تھے، اس سے کہیں بڑھ کر پیارے انسان تھے۔ (راشٹریہ سہارا دہلی)

● گلبرگہ، 19 نومبر۔ اردو کے ممتاز صحافی، شاعر اور ادیب جناب محسن کمال اور جناب محمد بشیر الدین سبجیکٹ انسپکٹر (موظف) محکمۂ تعلیمات گلبرگہ کے سانحہ ہائے ارتحال پر انجمن ترقی اردو ہند (شاخ) گلبرگہ کی مجلسِ عاملہ کا تعزیتی اجلاس 17 نومبر 2002 کو زیرِ صدارت محمد عبدالعظیم منعقد ہوا۔ وہاب عندلیب صدر کرناٹک اردو اکادمی، بنگلور، پروفیسر محمد ہاشم علی، ڈاکٹر جلیل تنویر، امجد جاوید، خواجہ پاشاہ انعامدار، عبدالحمید، اور قاسم شاہ پوری نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ جلسے میں محمد بشیر الدین صاحب کی تعلیمی خدمات اور مرحوم محسن کمال صاحب کی ادبی، سیاسی و سماجی خدمات کو سراہا گیا۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی، 28 نومبر۔ ہندی کے ممتاز ترقی پسند شاعر اور اردو زبان و ادب و غالب کی شاعری کے شیدائی شیو منگل سنگھ سُمن کے انتقال پر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی میں تعزیتی جلسہ منعقد ہوا۔ جس کی صدارت پروفیسر صادق، صدر شعبۂ اردو نے کی اور شعبے کے دیگر اساتذہ نے سُمن کی شخصیت اور فن پر روشنی ڈال کر خراج عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر شیو منگل سنگھ سُمن کا اجین میں طویل علالت کے بعد 27 نومبر کو انتقال ہو گیا تھا۔ وہ 86 برس کے تھے۔

اس موقعے پر صدر شعبۂ اردو پروفیسر صادق نے کہا کہ شیو منگل سنگھ سُمن اردو ہندی مشترکہ تہذیب کے علمبردار تھے۔ وہ ہندی میں ترقی پسند ادبی تحریک کے اہم سالاروں میں سے تھے۔

پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ شیو منگل سنگھ سمن ہندی کے ایسے شاعر و ادیب تھے جن کے یہاں ہندی اور اردو کی یکساں طور پر قدر تھی اور وہ اردو کو تہذیب و تمدن کی علامت تصور کرتے تھے۔

پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ شیو منگل سنگھ سُمن کی شخصیت بڑی تہہ دار تھی۔ آنجہانی عمدہ خطیب تھے اور اپنی تقریروں میں اردو اشعار کا برملا استعمال کرتے تھے خصوصاً غالب کے مشکل سے مشکل اشعار نہیں بخوبی ازبر تھے۔ مصطفیٰ خاں مداح کی اردو ہندی لغت کا آٹھواں ایڈیشن بھی انھیں کے عہدۂ صدارت میں شائع ہوا جو ہندی حلقوں میں بے حد مقبول ہے۔ ڈاکٹر ابن کنول نے سُمن کی اردو نوازی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہندی اور اردو کے مشترکہ کلچر سے محبت کرنے والا شاعر ہم سے جدا ہو گیا۔ ڈاکٹر علی جاوید نے سمن کی شاعری کو عوامی زندگی اور اس کے احساسات و جذبات کا مرقع قرار دیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر توقیر احمد خاں، نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس تعزیتی جلسے میں ڈاکٹر نگہت ریحانہ خاں ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر ابو بکر عباد، ڈاکٹر ارجمند آرا اور ڈاکٹر محمد کاظم کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات شریک ہوئے۔ (قومی آواز دہلی)

● علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ صحافت و عوامی ترسیل میں پبلک ریلیشنز نصاب کی طلبہ و طالبات کی جانب سے "کیمپس بز" نامی جریدے کی اشاعت شروع کی گئی ہے۔ اس جریدے کے پہلے شمارے کا اجرا شعبۂ صحافت و عوامی ترسیل کے سربراہ جناب شافع قدوائی نے کیا۔

"کیمپس بز" میں طلبہ نے اپنے اداریے میں تحریر کیا ہے کہ اس جریدے کی اشاعت کا مقصد محض نصاب تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ طلبہ کو دنیا کے اہم واقعات سے روشناس کرانا ہے۔ (قومی آواز دہلی)

□□□

تبصرہ و تعارف

معاشیات کے بنیادی اصول / سراج الحسن

صفحات:368، قیمت:-/82 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6،
آر کے پورم، نئی دہلی

مبصر: معین الدین خاں

ایک ہمہ گیر زبان اپنے اندر تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ عصری علوم کو پیش کرنے کی استطاعت رکھتی ہے اور اب ایسا کرنا اس کے وجود کے لیے ناگزیر ہو گیا ہے۔ خصوصاً آج کے اطلاعاتی دور میں جب کہ ہمارا کثیر اللسانی معاشرہ ان زبانوں سے اپنا ناطہ کمزور کر رہا ہے جو اس کو عصری علوم سے آراستہ کرنے میں ناکام ہیں۔ اس پس منظر میں اردو قارئین کے لیے "قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان" کے ذریعے شائع کردہ سراج الحسن کی کتاب "معاشیات کے بنیادی اصول" ایک قابلِ قدر تحفہ ہے۔

گیارہ ابواب پر مشتمل 368 صفحے کی اس کتاب میں علم معاشیات کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عموماً علم معاشیات کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی پیداوار (Production)، تقسیم (Distribution)، مبادلہ (Exchange) اور صَرف (Consumption)۔ پہلے باب میں علم معاشیات کی تعریف (Definition) اس کی ماہیت اور وسعت کا ذکر ہے۔ مختلف ادوار میں متعدد ماہرین نے اس کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ ایک ماہر معاشیات کا کہنا ہے کہ اگر پانچ ماہرین معاشیات ایک تعریف کو وضع کرنے کے لیے بیٹھیں تو وہ چھ تعریفیں وضع کر لیں گے۔ مصنف نے سارے ماہرین کی تعریفوں کو تین اہم حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول، کلاسیکی مکتب خیال کے روح رواں آدم اسمتھ نے معاشیات کو حصولِ دولت کی تعلیم سے تعبیر کیا۔ دوم نو کلاسیکی مکتبِ خیال کے علمبردار الفرڈ مارشل (Alferd Marshall) نے اسے انسانی سماج کی فلاح کا علم بتایا اور سوم، جو آج سب سے اہم ہے، جدید مکتبِ خیال کے مطابق "معاشیات لامحدود انسانی خواہشات اور محدود وسائل اور وسائل کے متبادل استعمال سے بحث کرتی ہے۔ مصنف نے اس باب میں اس علم کے دوسرے سماجی علوم سے تعلقات پر بھی بحث کی ہے۔

معاشیات کا خواہ کوئی اصول ہو، وہ ایک مخصوص صورتِ حال میں ہی قابلِ عمل ہوتا ہے اور بعض اصولوں کے مستثنیات بھی ہوتے ہیں۔ اس کتاب میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے۔ معاشیات کی بنیادی اصطلاحوں مثلاً احتیاج، اشیا، افادہ اور معیارِ زندگی وغیرہ میں دوسرے باب میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہاں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ علم معاشیات صرف ذہنی ورزش فراہم نہیں کرتی بلکہ کئی فیصلے لیتے وقت ہماری عملی زندگی میں بڑی معاونت کرتی ہے۔ تیسرے باب میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک صارف (Consumer) اشیا کو خریدتے وقت کن امور پر غور کرتا ہے۔ یہاں صارف کی بچت کا ذکر بھی ملتا ہے۔ آئندہ ابواب میں طلب اور رسد کے اصولوں سے بحث کی گئی ہے۔ طلب کے جدول اور قانون طلب، اور متبادل اشیا کے استعمال، قیمت کی لچک اور لچک کی پیمائش وغیرہ سے متعلق خاصی اہم باتیں بتائی گئی ہیں۔

معاشیات میں پیداوار کے چار عوامل۔ زمین، محنت، سرمایہ اور کار اندازہ (Entreprenues) تسلیم کیے گئے ہیں۔ زمین سے یہاں مراد تمام قدرتی وسائل ہیں جن کے پیدا کرنے میں انسانی جدوجہد شامل نہیں ہے۔ محنت کے بیان میں آبادی کا ذکر آیا ہے اور اس میں مالتھس (Malthus) کا نظریۂ آبادی اور معیاری آبادی کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ پیداواری عمل میں ایک تیسرا اہم عنصر سرمایہ یا (Capital) ہے۔ اس کی اہمیت کیوں اور کیسے ہے، اس کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ کار اندازہ وہ ہے جو اوّل تینوں ذرائع کو استعمال کر کے پیداوار کی شروعات کرتا ہے۔

چھٹے باب میں رسد کی تعریف اور اس کو متاثر کرنے والے عناصر کا ذکر ہے۔ پیداواری عمل میں لاگت کی مختلف قسمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ لاگت سے مراد وہ تمام اخراجات ہیں جو کسی شے کی پیداوار پر آتے ہیں۔ ان کی تفصیل ساتویں باب میں دی گئی ہے۔ آٹھویں باب میں بازار کے مفہوم اور اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آئندہ ابواب میں بازار میں مسابقت، اجارہ داری اور اجارہ دارانہ مسابقت کو پیش کیا گیا ہے۔ ان سبھی ابواب میں سیر حاصل مطالعہ کیا گیا ہے اور کہیں بھی تشنگی کا احساس نہیں ہوتا لیکن یہاں ایک باب کی کمی کھٹکتی ہے اور وہ ہے، مختلف پیداوار کے عوامل کو دیا جانے والا معاوضہ۔ زمین کے لیے لگان، محنت کے لیے مزدوری، سرمایہ کے لیے سود اور کار اندازہ کو منافع۔ اس کا ذکر ضرور ہونا چاہیے تھا۔ فہرستِ ابواب میں صفحات نمبر کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب انٹرمیڈیٹ اور گریجویٹ سطح کے طالب علموں کے لیے ایک نادر تحفہ ہے۔ مصنف نے اپنی باتوں کو مثالوں اور

ذیلوں کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ جدول اور گراف کا مناسب استعمال کیا گیا ہے۔ عام فہم زبان کو برتا گیا ہے، اہم اصطلاحوں کے سامنے انگریزی اصطلاحیں بھی درج کی گئی ہیں۔ معاشیات کی یہ کتاب طالب علموں کے ساتھ اردو کے عام قاری کے لیے بھی سود مند ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، جیسے مقتدر اداروں کے لیے اچھی کتابوں کو شائع کر دینا ہی کافی نہیں، اس کی کوشش ہونی چاہیے کہ یہ کتابیں اس کے ہدفی قارئین تک پہنچیں۔ کم از کم بہار اور جھارکھنڈ میں ہر سال ہزاروں طالب علم مدارس میں مناسب کتابوں کی عدم فراہمی کی وجہ سے ہندی اور انگریزی میں کتابیں پڑھنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔ ان کے حق میں کچھ کرنا چاہیے۔

آخر میں Suggested Reading کے تحت کچھ کتابوں کا نام بھی دے دیا جاتا تو اچھا ہوتا۔

•

انوار سہیلی کی کہانیاں / ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی

صفحات 183، قیمت:-/23 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، ونگ-6،
آر کے پورم، نئی دہلی

مبصر: ملک راشد فیصل

حیات انسانی کے باغ کو سرسبز رکھنے اور نشو ونما دینے میں دوسرے بڑے عوامل کے علاوہ اخلاقی کہانیوں کا بھی ایک اہم مقام رہا ہے جو آج تک باقی ہے۔ البتہ کہانی کی شکلیں وقت اور حالات کے دھارے کے مطابق تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ زمانہ قدیم میں جب انسانی تہذیب کا وجود نہیں تھا اور انسان اپنی خوراک کی تلاش میں دن بھر جنگلوں میں بھٹکتا پھرتا تھا، ایسے وقت میں اس کا سامنا دن بھر قسم قسم کے جانوروں اور پھلوں پھولوں سے ہوتا تھا۔ چنانچہ شام کو وہ اپنے تجربات و مشاہدات اشاروں میں اپنے ساتھیوں کو بتاتا تھا کیوں کہ اس وقت زبان نے بھی جنم نہیں لیا تھا۔ انسانی تہذیب کے آغاز کے ساتھ زبان کا بھی آغاز ہوتا ہے اور دھیرے دھیرے زندگی بھی پیچیدہ ہوتی جاتی ہے۔ زندگی کے مسائل اور پیچیدگیوں سے ہی کہانی اپنا مواد اخذ کرتی ہے۔ کہانی کے کردار وقت اور حالات کے ساتھ بدلتے رہے۔ کبھی یہ جن، دیو اور پری کی شکل میں آئے، کبھی جانوروں اور پرندوں کی زبان سے زندگی کی حقیقتیں بیان کی گئیں تو کبھی شہزادوں، وزیروں، وزیرزادوں، تاجروں اور درویشوں کی زبان سے ان کی زندگی کے نشیب و فراز پیش کیے گئے۔ یوں پڑھنے اور سننے والوں کو نصیحتیں کی گئیں۔ موجودہ دور میں ناولوں اور مختصر افسانوں سے یہی کام لیا جا رہا ہے۔

"انوار سہیلی" ملا حسین واعظ کاشفی کے ان تراجم میں سے ایک ہے جو دنیا کے متعدد ملکوں میں مختلف زمانوں میں کیے گئے۔ ان سبھوں کی اصل "پنچ تنتر" ہے جسے بھارت میں 1600 برس قبل سنسکرت زبان میں لکھا گیا۔ کلاسیکی ادب میں صاف ستھری زبان اور عمدہ کہانیوں کی وجہ سے صدیوں سے اس کی پذیرائی ہوتی رہی ہے۔ اخلاقی اور ادبی کہانیوں اور قصہ در قصہ کا یہ مجموعہ قارئین میں کافی مقبول رہا ہے۔ اس کی رسائی ایک تہذیب سے دوسری تہذیب میں ترجمے کے عمل سے ہوئی۔ سب سے پہلے اس کا ترجمہ چھٹی صدی عیسوی میں ایران کے بادشاہ نوشیرواں کے حکم سے پہلوی زبان میں ہوا۔ اس کے بعد اسے سامی اور پھر عربی میں خلیفہ المنصور (784-753 صدی عیسوی) کے عہد میں منتقل کیا گیا۔ عربی میں اس کا ترجمہ ابوالمعالی نصراللہ بن محمد نے "کلیلہ و دمنہ" کے نام سے کیا جو قصے میں دو لومڑیوں کے نام ہیں۔ ملا حسین واعظ کاشفی نے عربی طرز پر فارسی میں "انوار سہیلی" لکھی۔ کاشفی نے تقریباً ایک سو حکایتیں بیان کی ہیں جو کلیلہ و دمنہ میں موجود ہیں۔ انھوں نے عربی طرز پر فارسی اشعار کا استعمال کیا ہے، البتہ اس کی زبان سادہ ہے۔

زیر تبصرہ مرتب شدہ کتاب میں "انوار سہیلی" کی چھیالیس مختصر کہانیاں پیش کی گئی ہیں جو مختلف نصیحتوں اور سبق آموز باتوں پر مبنی ہیں۔ جانوروں اور انسانوں کی زبان سے کہی گئی یہ کہانیاں نہ صرف بچوں بلکہ نوجوانوں کے لیے بھی مفید ہیں۔ اس کتاب میں کہانی کے خیال کو اخذ کر کے اپنے طور پر قصے کو پیش کیا گیا ہے لیکن کہیں بھی کہانی کی اصل روح یا متن کو مجروح نہیں ہونے دیا گیا ہے۔ انوار سہیلی کی متعدد کہانیوں میں سے صرف انھی کا انتخاب اس کتاب کے لیے کیا گیا ہے جو 12 سے 17 سال کے بچوں کے لیے مناسب ہیں لیکن بحیثیت مجموعی یہ کہانیاں تمام عمر کے لوگوں کے لیے سود مند ہیں۔ کہانیوں کے عنوانات ان کے موضوع کو مدنظر رکھتے ہوئے جدید طرز پر دیے گئے ہیں۔ اخیر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی درج ہے۔ یوں بچے، بڑے اور کم اردو جاننے والے سبھی اس کتاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

•

دیوانِ میر دوم (عکسی) / مرتب: سنجے گوڑبولے

294 صفحات، -/300 روپے

ناشر: اسحاق پبلی کیشنز، سائرہ منزل، 230/B/102، وامان درشن، سنجے پارک
لوہ گاؤں روڈ، پونہ-411032

مبصر: سرور الہدیٰ

دیوانِ میر دوم، عکسی (مرتبہ سنجے گوڑبولے) کا مخطوطات سے دلچسپی

رکھنے والوں کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے۔ ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے یہ ضروری ہے کہ ہم اس خط اور املا سے آشنا ہوں جس کے توسط سے قدما کی تحریریں ہم تک پہنچی ہیں۔ مخطوطات کی اہمیت کے پیش نظر ہی بعض محققین کی رائے ہے کہ کلاسیکی متون کی ترتیب و تدوین میں پرانے املا کو برقرار رکھا جائے تاکہ اس کی تاریخی حیثیت میں کوئی فرق نہ آئے۔ اس میں شک نہیں کہ مخطوطے ہمارے ادبی سرمائے کا بنیادی ماخذ ہیں مگر ایک عام قاری کے لیے یہ ضروری ہے کہ شاعر کا کلام اس شکل میں سامنے آئے کہ وہ آسانی سے شاعر کو سمجھ سکے۔

نجے گوڑ بولے نے دیوانِ میر دوم عکسی شائع کر کے جہاں ایک طرف مخطوطے سے اپنی دلچسپی کا ثبوت فراہم کیا ہے وہیں دوسری طرف ادب کے قارئین کو بھی اس جانب متوجہ کیا ہے کہ کلاسیکی متون کو کبھی کبھی قدیم طرز املا کے ساتھ بھی پڑھنا چاہیے۔ گوڑ بولے صاحب کے مطابق اس نسخے کی کتابت 1840 میں ہوئی۔ گویا یہ مخطوطہ میر کے انتقال کے تیس سال بعد کا ہے۔ گوڑ بولے صاحب نے لکھا ہے "مجھے مخطوطے جمع کرنے کا شوق ہے۔ ایک دن اچانک میر تقی میر کے دیوانِ دوم کا مخطوطہ میرے ہاتھ لگا۔ جس کی سائز 18X30 سینٹی میٹر تھی۔ کاغذ کے اوپر واٹر مارک تھا جس پر 1840 درج ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ مخطوطہ 1840 میں میر کی وفات کے تیس سال بعد نقل کیا گیا تھا۔" نجے گوڑ بولے نے یہ نہیں بتایا کہ انھیں یہ نسخہ کہاں ملا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نسخے کو بہت اہتمام اور حفاظت سے رکھا گیا ہوگا۔ اس کی کتابت اتنی صاف اور واضح ہے کہ لگتا ہے ابھی حال ہی میں کتابت مکمل ہوئی ہو۔ کتابت بھی خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ جس کاغذ پر 1840 درج ہے اگر اس کو بھی دیوان کے ساتھ شائع کر دیا جاتا تو مناسب ہوتا۔ تاریخوں کے ساتھ بعض مخطوطوں میں مہریں بھی ہوتی ہیں ان سے اس کا سراغ لگ سکتا ہے کہ مخطوطے کا زمانہ کیا ہے۔ اس مخطوطے کے کاتب کا کہیں نام درج نہیں ہے، ویسے مخطوطوں میں عام طور پر کاتبوں کی جو ستم ظریفیاں راہ پا جاتی ہیں، ان سے یہ مخطوطہ بڑی حد تک محفوظ ہے۔ پورے دیوان میں صرف ایک غزل حاشیے میں درج ہے جس کا مطلع ہے۔

کجی اس کی میں جو جتانے لگا
مجھے سیدھاں وہ سنانے لگا

یہ غزل سات شعر کی ہے جس کے اخیر کے تین اشعار کے ثانی مصرعے حاشیے میں کٹ جاتے ہیں۔ لگتا ہے کہ طباعت کے وقت الفاظ دب گئے ہیں یا پھر مخطوطے میں اسی طرح ہوں۔ مقطع کا ثانی مصرعہ نیچے کی پہلی غزل کے مقطع کے شعر کے ٹھیک نیچے کاتب نے لکھ دیا ہے۔ شاید جگہ کی کمی کے باعث ایسا کیا گیا ہو۔ ردیف "ک"، "گ" کی غزلوں میں ترتیب کا خیال کاتب نے نہیں رکھا۔ ک کی غزل گ میں اور "گ" کی غزل "ک" میں لکھ کر اسے خلط ملط کر دیا ہے۔

کلیاتِ میر از احتشام حسین کے دیوانِ دوم کو میں نے اس عکسی ایڈیشن کے سامنے رکھ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ ان دونوں میں اختلاف کیا ہے۔ چوں کہ اس وقت کلیاتِ میر کی پہلی جلد کا ہی ایڈیشن میرے سامنے ہے، اگر دوسرے ایڈیشن ہوتے تو یہ مطالعہ دلچسپ ہو سکتا تھا۔

خواہان مرگ میں ہیں ہوا ہوں مگر نیا
جی پیچھے ہی پھرے ہے خریدار عشق کا
(عکسی)
خواہانِ مرگ میں ہی ہوا ہوں مگر نیا
جی پیچھے ہی پھرے ہے خریدار عشق کا
ان رستموں کے دعوے کو دیکھا ہے ہوتے قطع
پورا جہان لگا ہے کوئی دار عشق کا
(عکسی)
دل رستموں کے دعوے کو دیکھا ہے ہوتے قطع
پورا جہاں لگا ہے کوئی دار عشق کا
ہاتھ آئینہ رویوں سے اٹھا بیٹھیں یہ کیوں کر
بالعکس اثر پاتے ہم اپنی دعا کا
(عکسی)
ہاتھ آئینہ رویوں سے اٹھا بیٹھیں نہ کیوں کر
بالعکس اثر پاتے ہم اپنی دعا کا
ایک سا عالم نہیں رہتا ہے اس عالم کے بیچ
اب جہاں کوئی نہ تھا یاں ایک عالم ہو گیا
(عکسی)
ایک سا عالم نہیں رہتا ہے اس عالم کے بیچ
اب جہاں کوئی نہیں یاں ایک عالم ہو گیا
اس لب جاں بخش کی حسرت نے مارا جان سے
آب حیواں یمنِ طالع سے مرے سم ہو گیا
(عکسی)
اس لبِ جاں بخش کی حسرت نے مارا جان سے
آبِ حیواں یمنِ طالع سے مرے ضم ہو گیا
عشق ان شہری غزالوں کا جنوں کو اب کھینچا
وحشتِ دل بڑھ گئی آرام جاں رم ہو گیا
(عکسی)

عشق ان شہری غزلوں کا جنوں کو اب کھینچا
وحشتِ دل بڑھ گئی آرامِ جاں رم ہو گیا

کتاب کے پہلے حصے میں "ذکر میر" (نجیب گوڑ بولے) "میر سے متعلق" (نذیر فتح پوری)۔ "توقیتِ میر" (کالی داس گپتا رضا) کے عنوانات کے تحت مضامین شامل ہیں۔ "توقیتِ میر" ایک بڑا کام ہے۔ رضا صاحب اس خطی نسخے کے بارے میں کچھ لکھ جاتے تو اس کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی۔

•

سردار جعفری کے خطوط / ڈاکٹر خلیق انجم

صفحات 248، -/175 روپے
ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی
مبصر: عبدالرب

اردو میں مکاتیب کی اشاعت کا سلسلہ کافی پرانا ہے لیکن اس کی ادبی حیثیت خطوطِ غالب کی اشاعت نے متعین کی اور پھر مشاہیر کے خطوط کی ترتیب و اشاعت کا سلسلہ چل نکلا اور اس طرح خطوط کا قابلِ قدر سرمایہ ہمارے ادبی ذخیرے میں محفوظ ہو گیا۔ خطوط کے ذریعے ہمیں مکتوب نگار یا اس کے معاشرے اور عہد سے متعلق بعض ایسی باتیں بھی معلوم ہو جاتی ہیں جن تک رسائی دوسرے وسائل سے ممکن نہیں۔ چنانچہ مورخین اور سوانح نگاروں کے لیے بسا اوقات خطوط اہم ماخذ ثابت ہوتے ہیں۔

علی سردار جعفری کو ایک بلند پایہ شاعر اور ترقی پسند تحریک کے علمبردار کی حیثیت سے جو شہرت ملی وہ کم ہی کسی کے حصے میں آئی ہے۔ وہ شاعر کے علاوہ اعلیٰ درجے کے نثر نگار، نقاد اور صحافی بھی تھے۔

سردار جعفری کے خطوط اپنے عہد کے علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی کوائف سے بھی واقفیت بہم پہنچاتے ہیں اور ان کے ذریعے سردار جعفری کی زندگی کے بعض مخفی گوشے بھی واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ تو ان سے قریبی تعلق رکھنے والے بیشتر لوگوں کو معلوم ہو گا کہ وہ اکثر و بیشتر مالی دشواریوں سے دوچار رہے لیکن یہ شاید ہی کسی کو معلوم ہو کہ ایک بار نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان دشواریوں سے پریشان ہو کر انھوں نے اپنا فلیٹ تک بیچنے کا ارادہ کر لیا تھا۔

جعفری صاحب جب کوئی ادبی کام شروع کرتے تو جب تک وہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جاتا، اطمینان کی سانس نہ لیتے۔ اس کی ایک مثال رسالہ "گفتگو" کے ترقی پسند ادب نمبر کی اشاعت ہے۔ اس سلسلے کے تقریباً تیس خطوط پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کے نام اس مجموعے میں شامل ہیں۔

اردو زبان کے ساتھ حکومت کے غیر منصفانہ رویے سے انھیں بڑا دکھ ہوتا تھا، اس مجموعے میں ایسے کئی خطوط ہیں جن میں اردو کی حق تلفیوں پر گہرے رنج کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان خطوط کی مدد سے آزاد ہندستان میں پچھلے پچاس برس میں اردو کی صورتِ حال کا جائزہ بخوبی لیا جا سکتا ہے۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر خلیق انجم نے کتاب کے مقدمے کے بیشتر حصے میں اسی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ پھر آزادی کے بعد ادبا و شعرا کو جس طرح مختلف خانوں میں بانٹا گیا، اس کا ذکر بھی ان خطوط میں ملتا ہے۔ اقبال اس رویے کا بری طرح شکار ہوئے تھے ایک خط سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

"رہا اقبال کی "خاردار شخصیت" کا سوال تو اس عہد کا طبقاتی کردار ہی ایسا تھا، ہر شخصیت خاردار ہے۔ سوامی دویکانند اور اقبال میں عجیب و غریب مماثلت ہے، وہ محترم آزادی کے پروانے مگر ہندو احیا پرست تھے، اقبال مسلم احیا پرست تھے۔ یہ احیا پرستی انیسویں صدی میں راجہ رام موہن رائے میں بھی مل جائے گی اور سرسید میں بھی۔ پہلے کلکتہ میں ہندو کالج بنا پھر علی گڑھ میں مسلم اورینٹل کالج۔ پہلے بنارس میں ہندو یونی ورسٹی قائم ہوئی پھر علی گڑھ میں مسلم یونی ورسٹی اور بنارس کی یونی ورسٹی کے ساتھ ہندو لفظ پر ٹیگور نے اصرار کیا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہندو احیا پرستی نیشنلزم کے لبادے میں چھپ جاتی ہے اور مسلم احیا پرستی نمایاں ہو جاتی ہے۔"

سردار جعفری کے یہ خطوط ان کی ادبی خدمات کے علاوہ مختلف قسم کے لوگوں سے ان کے وسیع تعلقات نیز ان کی متنوع دلچسپیوں پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ خطوط کے اس مجموعے میں جعفری صاحب کے چند خطوط کا عکس بھی شامل ہے جس سے اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

•

عبدالقوی دسنوی: ایک مطالعہ / ڈاکٹر محمد نعمان، کوثر صدیقی

صفحات 508، -/350 روپے
ناشر: دبستانِ بھوپال، دیبو لا، گوتری مین روڈ، بھوپال
مبصر: ظفر احمد نظامی

اردو میں سوانحی ادب کا بڑا فقدان ہے۔ اگر کسی نامور شخصیت پر بھی مضمون لکھنا ہو تو اس پر مواد اکٹھا کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مرحوم شخصیتوں پر تو کہیں نہ کہیں سے مواد فراہم ہو جاتا ہے لیکن زندہ افراد پر معلومات بہت کم میسر آتی ہیں جب تک خود ان سے براہِ راست رابطہ قائم نہیں کر لیا جاتا۔ "عبدالقوی دسنوی۔ ایک مطالعہ" اسی سمت میں ایک صحت مند اور تعمیری کوشش ہے جس میں قوی صاحب سے متعلق مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا تعلق علامہ سید سلیمان ندویؒ کے وطن

قصبہ دسنہ ضلع پٹنہ (بہار) سے ہے۔ وہ اردو ادب کے استاد اور معروف محقق و نقاد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ان کا ادبی سفر نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ مختلف موضوعات پر تین سو سے زیادہ مضامین تبصرے، اور تمیں سے زیادہ کتابیں تصنیف اور اتنی ہی کتابیں مرتب کر کے دامنِ اردو کو مالا مال کر چکے ہیں۔

دسنوی صاحب 1961 میں بھوپال تشریف لائے اور وہاں کے مشہور تعلیمی ادارے سیفیہ کالج سے وابستہ ہو گئے۔ بقول مرتب محمد نعمان "دسنوی صاحب کی ادبی خدمات ہی لائقِ تحسین نہیں بلکہ بحیثیت استاد تمیں سال تک عبادت کی طرح فرائضِ منصبی انجام دے کر محدود وسائل میں انھوں نے جس طرح شعبۂ اردو اور اس کے کتب خانے کی توسیع و ترقی نیز طلبہ کی تعلیم و تربیت سے متعلق اہم اور تاریخ ساز خدمات انجام دی ہیں، اس کی مثال فی زمانہ شاذ و نادر ہی مل سکے گی۔" زیرِ نظر کتاب کا مقصد دسنوی صاحب کے کثیر الجہات ادبی کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہے۔

کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ مضامین اور دوسرا منظومات پر مشتمل ہے۔ تیسرے حصے میں حیات نامے کے تحت نسب نامہ، سرگذشت، تاثرات اور تبصرے شامل ہیں۔ مضامین کی تعداد 31 ہے جو دسنوی صاحب کی حیات اور خدمات کا احاطہ کرتے ہیں جن میں صاحبانِ قلم نے ان کی زندگی کے مختلف گوشوں، اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے۔ جن قلم کاروں نے ان کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے ان میں پروفیسر گیان چند جین، پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی، پروفیسر عبدالمغنی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر حامد حسین، پروفیسر حنیف نقوی، پروفیسر مظفر حنفی، پروفیسر حکیم ظل الرحمن، پروفیسر آفاق حسین، عارف عزیز، خالد عابدی، ڈاکٹر یعقوب یاور، ڈاکٹر خالد محمود، کوثر صدیقی جیسے حضرات شامل ہیں۔

حصہ نظم گیارہ منظومات پر مشتمل ہے جن میں دسنوی صاحب کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اس حصے میں سلام مچھلی شہری، ارشد صدیقی، رہبر جون پوری، ظفر صہبائی، کوثر صدیقی، ظفر نسیمی، وفا صدیقی، ارمان اکبر آبادی، کامل بہزادی، متین قریشی اور اقبال مسعود کی شعری کاوشیں شامل ہیں۔ "حیات نامہ" ڈاکٹر محمد نعمان کا مرتب کردہ ہے۔ اس حصے میں عبدالقوی دسنوی کی زندگی سے متعلق معلومات درج ہیں، ان کی مطبوعات کی فہرست شامل ہے اور رسائل کے خاص نمبروں اور کتابوں میں ان کی تحریروں کی تفصیل درج ہے۔ اس طرح دسنوی صاحب کی تصنیفات پر مختلف رسائل کے تبصرے بھی پیش کر دیے گئے ہیں۔

کسی فردِ واحد پر اتنے بہت سے مضامین اور اس کی اتنی بہت سی کتابوں پر اتنے سارے تبصروں کا جمع کر لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ واقعی ڈاکٹر محمد نعمان اور کوثر صدیقی نے بڑی عرق ریزی سے اتنی ضخیم کتاب مرتب کر کے نہ صرف دسنوی صاحب کو شاندار خراجِ تحسین پیش کیا ہے بلکہ بھوپال اور اس کے شعر و ادب کا نام بھی بلند کیا ہے۔ نعمان صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ دسنوی صاحب "ایک مثالی استاد ایک اچھے انسان ہیں، ایک درخشاں روایت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسا چراغ ہیں جس کی لو سے کئی چراغ روشن ہوئے اور جس کی آبیاری کے سبب پودے چھتنار درخت بن کر باغِ اردو کو معطر اور تر و تازہ رکھنے میں مصروف ہیں۔"

•

ارمغانِ سرور / پروفیسر اصغر عباس

صفحات 261، -/150 روپے

ناشر: انجمن ترقیِ اردو ہند، اردو گھر، 212 راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002

مبصر: محمد خالد

پروفیسر آلِ احمد سرور ہمارے عہد کی اہم علمی ادبی شخصیت تھے، باریک بیں و بالغ نظر اور مشرقی و مغربی علوم و فنون سے یکساں طور پر واقف دانشور اور زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے مقدمے کے وکیل۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر اصغر عباس نے سرور صاحب کی زندگی میں ان کی علمی و ادبی خدمات پر دو روزہ قومی سیمینار 24-25 فروری کو منعقد کیا تھا جس میں 26 مقالہ نگاروں نے اپنے مقالے پڑھے تھے۔ یہ مقالے سرور صاحب کی شخصیت کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر مباحث کے دروازے کھولتے ہیں۔ اس کتاب میں یہ مقالے یکجا کر دیے گئے ہیں۔

خطبۂ استقبالیہ میں پروفیسر اصغر عباس نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، خصوصاً شعبۂ اردو کے حوالے سے سرور صاحب کی خدمات اور بلا تفریق اساتذہ اور طلبہ سے ان کے تعلقات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا ہے۔ خطبۂ صدارت میں سید حامد نے سرور صاحب کی عصری آگہی، اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے ان کی کوششوں اور ان کی ادبی خدمات نیز معاصرین سے ان کے مراسم کا جائزہ لیا ہے۔ شمس الرحمان فاروقی نے اپنے مقالے "سرور دانشور" میں سرور صاحب کی دانشوری کا موازنہ کرتے ہوئے ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

خود سرور صاحب کا کہنا تھا کہ "اردو میں دانشوری کی روایت زیادہ مستحکم اور توانا نہیں رہی۔ سارے مشرق میں فکر روشن اور بیدار ذہن کی کارفرمائی جیسی ہونی چاہیے، ویسی نہیں ہو پائی۔" پروفیسر ریاض الرحمان خاں شیروانی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر سید عبدالباری نے بھی

سرور صاحب کی شخصیت کے دانشورانہ پہلوؤں پر گفتگو کی ہے۔

پروفیسر شارب ردولوی نے اپنے مقالے۔ "آل احمد سرور: نظر اور نظریے تک" میں سرور صاحب کی نظریاتی تنقید کو ان کے چند مضامین کی روشنی میں پرکھا ہے۔ ڈاکٹر خورشید احمد نے "سرور صاحب کی تنقید: معاصر تنقیدی فکر کی روشنی میں" کے زیر عنوان ہیئتی تنقید پر سرور صاحب کے نظریات سے بحث کی ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے سرور صاحب کے تنقیدی نظریات کا مختصراً جائزہ لیتے ہوئے انھیں مغربی ناقد ٹی ایس ایلیٹ پر ترجیح دی ہے۔ پروفیسر اے. سنگھ صدر شعبۂ ہندی، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ کا مقالہ ہندی میں تھا جس کا ترجمہ ڈاکٹر سیما صغیر نے کیا ہے۔ سنگھ صاحب اردو زبان کے رسم خط سے نابلد ہیں اس لیے انھوں نے سرور صاحب کی تخلیقات اور تنقیدی نظریات کے بارے میں ترجمے اور بات چیت پر منحصر تجزیہ کر کے عالمی پیمانے پر ان کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

سرور صاحب نے میر پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھی لیکن کئی مضامین لکھے ہیں۔ پروفیسر آل احمد سرور کی میر شناسی میں انھی مضامین پر مختصراً اظہار خیال کیا ہے۔ سرور صاحب کو اقبال کی شخصیت اور شاعری سے خصوصاً دلچسپی رہی۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے اپنے مقالے میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "فکر اقبال کے برخلاف فنی مباحث میں سرور صاحب کے یہاں تجزیہ و تحلیل کم اور مجموعی تبصرے کا انداز زیادہ ہے۔ وہ یہ تو بتاتے ہیں کہ اقبال کی زبان پہلودار، تشبیہات دل آویز، استعارات جلیل و جمیل اور علامات بامعنی ہیں۔ وہ شعر اقبال میں دروبست، ان کی نغمگی اور الفاظ کے کائنات بن جانے کا اشارہ بھی کرتے ہیں لیکن ان مباحث کا تفصیلی تجزیہ ان کے یہاں نہیں ملتا۔" سرور صاحب کی تنقیدی زبان پر دو اعتراضات عام طور سے ہوئے ہیں پہلا یہ کہ وہ دوٹوک بات نہیں کہتے اور دوسرا یہ کہ ان کی نثر میں شعریت کے عناصر کا زیادہ عمل رہتا ہے۔ سرور صاحب اعتدال پسند ناقد ہیں اس لیے دوٹوک بات کہنے سے پرہیز کرتے ہیں دوسری بات سے متعلق جناب عبداللہ ولی بخش قادری نے ایک بات کہی ہے جو قابل غور ہے کہ "اظہار معانی کے ساتھ زبان کا لطف بھی نصیب ہو جائے تو کیا مضائقہ۔"

سرور صاحب نے شاعری بھی کی ہے۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور ادبی تبدیلیوں کا عکس ہمارے سامنے لاتی ہے جس میں شاعر کی زندگی کے تجربات، مشاہدات اور تاثرات کا بھی عکس نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر سلطان احمد اور ڈاکٹر انجم آرا انجم نے سرور صاحب کی شاعری کو موضوع بنایا ہے۔ سرور صاحب 'علی گڑھ میگزین'' سہ ماہی "اردو ادب" اور ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے ایڈیٹر رہے ان سب میں ان کے اداریے چھپتے رہے۔ پروفیسر نورالحسن نقوی نے اپنے مقالے "سرور صاحب اپنے اداریوں کی روشنی میں۔" میں سرور صاحب کی علمی و تعلیمی، فکری و ذہنی، سماجی و تاریخی، تہذیبی و ادبی اور مشرقی و مغربی عصری آگہی کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔ سرور صاحب انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری بھی رہے۔ انجمن کے تعلق سے ان کی خدمات کا جائزہ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنے مقالے "سرور صاحب کی انجمن" اور ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب نے اپنے مضمون "آل احمد سرور اور انجمن ترقی اردو" میں پیش کیا ہے۔

سرور صاحب شکاگو یونی ورسٹی، امریکا میں ویزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے اکتوبر 1969 سے مارچ 1970 تک رہے اور امریکا سے متعلق ان کے تاثرات "ہماری زبان" میں برابر شائع ہوتے رہے۔ سرور صاحب نے امریکا کو کیسا پایا، اس کی وضاحت پروفیسر سعید المظفر چغتائی نے "سرور صاحب کے تاثرات امریکہ میں" بڑے خوبصورت انداز میں کی ہے۔ مولوی عبدالحق کے اصرار پر سرور صاحب کی تقرری Readership کے لیے لکھنؤ یونی ورسٹی میں 21 راگست 1946 کو ہوئی۔ از تقرری تا استعفیٰ یونی ورسٹی میں اور لکھنؤ میں ان کی تدریسی اور ادبی سرگرمیوں پر پروفیسر محمود الحسن نے "آل احمد سرور اور لکھنؤ" میں طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ جب کہ سلمیٰ صدیقی صاحبہ نے "ہمارے سرور صاحب" میں ان کی گھریلو زندگی اور نجی مصروفیتوں کو پیش کیا ہے۔ پروفیسر امیر عارفی نے "سرور صاحب چند تاثرات" میں شعبۂ اردو علی گڑھ سے اپنے تعلق کے حوالے سے سرور صاحب کی تدریسی زندگی کے بعض واقعات کو بہت پرلطف انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر شہناز ہاشمی اور پروفیسر زاہدہ زیدی کے مضامین بھی تاثراتی نوعیت کے ہیں۔ آخر میں محمد عرفان نے "سرور صاحب کی نذر" کے عنوان سے منظوم خراج عقیدت پیش کی ہے۔

•

کلیاں اور پھول / ڈاکٹر منوہن طالب

صفحات 144، قیمت -/75 روپے

ناشر: مرکز ادب، ایم۔ پی۔ کالج روڈ، بھوپال-462001

منوہن طالب کے اس شعری مجموعے میں غزلوں کے ساتھ گیت بھی شامل ہیں اور اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام تخلیقات اردو کے ساتھ ساتھ دیوناگری رسم خط میں بھی شامل کتاب ہیں۔

•

نگارشات / مؤلف، عزیز کاشمیری

صفحات139، قیمت-/100روپے
ناشر: نگینہ پرنٹنگ پریس، سری نگر-432530
یہ کتاب ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو مختلف علمی و ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

•

پیاری سی پہاڑی لڑکی / یوہاناشپیری، مترجم: مسعود احمد برکاتی

صفحات67، قیمت-/15روپے
ناشر: مکتبہ پیامِ تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی-25
یوہاناشپیری کی یہ کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی ہے اور مسعود احمد برکاتی نے عام فہم انداز میں اس ناول کا اردو ترجمہ پیش کیا ہے۔

•

خراٹوں کا مشاعرہ / نصرت ظہیر

صفحات112، قیمت-/20روپے
ناشر: مکتبہ پیامِ تعلیم، جامعہ نگر، نئی دہلی-25
"خراٹوں کا مشاعرہ" نصرت ظہیر کے ان مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے بچوں کے لیے ماہنامہ "پیامِ تعلیم" میں تحریر کیے۔ یہ مضامین بچوں میں بے حد مقبول ہوئے اور کتابی شکل میں ان کے آجانے سے بچوں کو یقیناً دلی مسرت ہوگی۔

•

مرشد آباد کی ایک نایاب مثنوی ہرمزنامہ

مرتب: ڈاکٹر محمد ہاشم
صفحات249، قیمت-/250روپے
ناشر: ڈاکٹر محمد ہاشم، کاشانہ، مقام و پوسٹ۔ رہٹ، ضلع۔ مدھے پورہ، بہار
ڈاکٹر محمد ہاشم نے شرف النساء بیگم کی مثنوی 'ہرمزنامہ' کی تدوین و ترتیب کا کام انجام دے کر ایک اہم فریضہ ادا کیا ہے۔ یہ تحقیقی کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل "حیات شرف النساء" باب دوم، "اردو مثنوی نگاری میں شرف النساء اور ہرمزنامہ کا مقام" اور تیسرا باب مثنوی کے مکمل متن پر مبنی ہے۔

•

کوکن کی خوشبو / ساحر شیوی

صفحات128، قیمت-/150روپے
ناشر: بزمِ تخلیقِ ادب، کراچی، پاکستان-75300
"کوکن کی خوشبو" ممتاز شاعر ساحر شیوی کی ہائیکو نظموں کا مجموعہ ہے۔

•

اصغر ویلوری — فن اور شخصیت / مرتبہ: پروفیسر محمد علی اثر

صفحات178، قیمت-/125روپے
ناشر: سرمدی پبلی کیشنز، 6 موہن داس لین، انا سالئی، چینئی-600002
یہ کتاب ممتاز شاعر اور صحافی اصغر ویلوری کی شخصیت اور فن پر مختلف نقادوں کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

•

ہم وطن / سعید احمد سندیلوی

صفحات139، قیمت-/100روپے
ناشر: مصنف، 435/89، رجب گنج، ٹھاکر گنج، لکھنؤ-3
"ہم وطن" محترمہ پریتی شری کبیر کا ناول ہے جس کا اردو ترجمہ سعید احمد سندیلوی نے پیش کیا ہے۔ ناول فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر لکھا گیا ہے۔

•

جوابات کوئز :

1- الف	2- ج	3- الف	4- د	5- الف	6- ب	7- ج	8- ب	9- الف	10- الف	11- ج
12- د	13- ج	14- الف	15- ب	16- الف	17- ب	18- الف	19- ج	20- ب	21- ب	22- الف
23- ج	24- ب	25- د	26- الف	27- ب	28- ب	29- الف	30- ج	31- ب	32- ج	33- ب
34- ب	35- ج	36- ج	37- ج	38- ج	39- الف	40- ب	41- ب	42- ج	43- ج	44- الف
45- ب	46- الف	47- د	48- ب	49- الف	50- د	51- ب	52- ج			

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ اور بچوں کا ادبی ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب ''ہمارے رہنما'' سے مولانا ابوالکلام آزاد کی مختصر سوانح پیش کی جارہی ہے جس کے مصنف ایس جی حیدر ہیں۔

''ہمارے رہنما'' میں ملک کے ان عظیم سپوتوں پر سوانحی مضامین شامل ہیں جنھوں نے جدوجہدِ آزادی میں اپنی جان کی بازی لگادی تھی۔ ان رہنماؤں میں بنکم چندر، اینی بیسنٹ، بھیکائی جی کاما، سروجنی نائیڈو، مولانا ابوالکلام آزاد، سی وی رمن، کملا نہرو اور لال بہادر شاستری شامل ہیں، جن کے سوانحی خاکے بالترتیب سکھاموئے بھٹا چارجی، جے رادھا کرشنن، دیپا اگروال، سرلاچگ موہن، ایس جی حیدر، دلیپ ایم سالوی، جوہی سنہا اور گرجارانی استھانانے تحریر کیے ہیں اور ان کا ترجمہ اقبال مہدی زیدی نے کیا ہے۔

ابوالکلام آزاد

جنگِ آزادی کے دو سپاہی، مولانا آزاد اور جواہر لال نہرو، ایک سال کے فرق سے 1888 اور 1889 میں پیدا ہوئے۔ چند ہی سال پہلے 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی تھی۔ عظیم رہنما اور گرو گاندھی جی پہلے ہی 1869 سے یہاں موجود تھے۔ ہندستان کی آزادی کی جدوجہد۔ 'بنا ہتھیاروں کی مہابھارت' کے لیے جنگ کا میدان تیار ہو رہا تھا۔

مکہ (عرب) میں رہ رہے ایک ہندستانی باپ اور عرب ماں کے ایک بیٹا محی الدین احمد پیدا ہوا، جس کا نام فیروز بخت بھی تھا۔ جو بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد یا صرف مولانا صاحب کے نام سے مشہور ہوا۔

شروع ہی سے اس بچے میں ایک امتیازی خصوصیت پائی گئی جو تمام عمر ان میں دکھائی دی۔

عام لوگ صرف ایک مولانا آزاد کو جانتے ہیں۔ قومی رہنما کو، جو واقعی وہ تھے، لیکن کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ لیڈر بننا انھوں نے کبھی نہیں چاہا تھا۔ اپنے ایک دوست کو انھوں نے لکھا ''سیاسی زندگی کے پیچھے میں کبھی نہیں بھاگا۔ دراصل سیاست نے آکر مجھے گھیر لیا۔۔۔۔''

مولانا آزاد ایک عالم، اخبار نویس، مصنف، شاعر، فلسفی اور سب سے بڑھ کر اپنے وقت کے ایک بڑے مذہبی عالم تھے۔

مہاتما گاندھی کی طرح وہ بھی ہندستان کی مختلف قومیتوں، خاص کر ہندو مسلمانوں میں اتحاد کے بڑے حامی تھے۔ اور گاندھی جی ہی کی طرح انھیں زندگی بھر دو دشمنوں سے لڑنا پڑا۔ برطانوی حکومت سے اور اُن لوگوں سے جو ہماری قوم کے اتحاد میں یقین نہیں رکھتے تھے۔

دوسرے بچوں کی طرح مولانا آزاد کو بھی بچپن میں گیس بھرے رنگین غبارے اچھے لگتے تھے اور وہ بھی تیرنے اور کھیلنے کودنے کے شوقین تھے۔ ان کا حافظہ بہت تیز تھا اور معلومات حاصل کرنے، پڑھنے، لکھنے اور بولنے کی اُن کی خواہش ہمیشہ بڑھتی ہی گئی۔ کھلی جگہوں

پر کھیلنے اور بچوں جیسی شرارتیں کرنے کو اُن کا بھی جی چاہتا تھا۔ لیکن انھیں یہ سب کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اُن کے والد اُن کو ایک پکا مذہبی عالم بنانا چاہتے تھے اور اس لیے اس طرح کی فضولیات میں انھیں وقت ضائع کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

عالم

آزاد کے پاس بہت ساری کتابیں تھیں اور قابل استاد تھے جو انھیں عربی، فارسی، اُردو، اور مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ ریاضی طِب خطاطی اور دوسرے علوم سکھاتے تھے۔ لیکن انگریزی سیکھنے کی اُنھیں بالکل اجازت نہیں تھی کیوں کہ یہ قابلِ نفرت فرنگیوں (انگریزوں) کی زبان تھی۔ خوش قسمتی سے انھیں انگریزی جاننے والے ایک صاحب مل گئے جن سے انھوں نے اے بی سی ڈی سیکھی اور پھر پہلی کتاب پڑھی۔ اس کے بعد بہت جلدی (ذہین تو تھے ہی) ڈکشنری کی مدد سے وہ اخبار اور 'بائبل' بھی پڑھنے لگے۔

چراغ کی دھیمی روشنی میں وہ رات کو دیر تک، کبھی کبھی صبح ہو جانے تک پڑھا کرتے تھے۔ اِس شوق میں بعض اوقات وہ کھانا کھانا بھی بھول جاتے تھے۔ اکثر اپنے پیسے وہ کتابیں خریدنے پر صرف کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں: "لوگ اپنا بچپن کھیل، کود، میں گزارتے ہیں لیکن بارہ تیرہ سال کی عمر میں، کوئی کتاب اُٹھا کر میں گھر کے ایک کونے میں جا بیٹھتا تھا۔ تاکہ لوگ مجھے نہ دیکھ سکیں۔"

اُن کی تحریر کے بارے میں ایک بڑے عالم نے لکھا "انگریزی زبان کے مشہور مصنف" سمرسیٹ مام، کی طرح مولانا آزاد نے لکھنا اسی طرح سیکھا جیسے مچھلی کے بچے 'تیرنا' یا انسان کے بچے، سانس لینا، سیکھتے ہیں۔"

پیش بین (آگے دیکھ لینے والا)

ایک انوکھی بات اُن میں یہ رہی کہ بہت سے معاملات میں وہ ہمیشہ اپنی عمر سے بہت آگے کے کام کرتے رہے۔ انھوں نے ایک لائبریری، ایک ریڈنگ روم، اور بحث و مباحثے کی ایک سوسائٹی قائم کر رکھی تھی جب کہ اُن کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ جب وہ پندرہ سال کے تھے تو اپنے سے تقریباً دُگنی عمر کے طالب علموں کو پڑھانے لگے تھے۔ تیرہ سے اٹھارہ سال کی عمر میں وہ کئی رسالوں کے ایڈیٹر رہے۔ اور سولہ سال کے تھے جب اُنھوں نے ایک اعلیٰ پائے کا رسالہ خود نکالنا شروع کر دیا۔ 1923 میں جب وہ انڈین نیشنل کانگریس کے صدر چنے گئے تو جواہر لال نہرو کے کہنے کے مطابق وہ کانگریس کے سب سے کم عمر صدر تھے۔

1904 میں لاہور کے لوگوں نے مولانا آزاد کو جن کے عالمانہ مضامین سے وہ بہت متاثر تھے۔ قومی سطح کے ایک اہم جلسے کو خطاب کرنے کے لیے بلایا۔ اُن کے استقبال کے لیے ہزاروں کی بھیڑ لاہور اسٹیشن پر جمع تھی۔ لیکن جب ایک دبلا پتلا گورا چٹا، سولہ سال کا نوجوان جس کے ابھی داڑھی بھی نہیں نکلی تھی، فرسٹ کلاس کے ڈبے سے نکلا تو اوّل تو اُن کو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ ہی نوجوان 'مولانا آزاد' ہے۔ پھر اُنھیں بڑی حیرت اور کچھ مایوسی بھی ہوئی۔ لیکن جب اس لڑکے نے ڈھائی گھنٹے سے زیادہ لمبی، یادگار تقریر کی تو سرسٹھ سال کے بوڑھے 'جلسہ کے صدر' مشہور شاعر اور عالم، مولانا حالی نے اُنھیں گلے سے لگاتے ہوئے کہا "عزیز صاحبزادے! مجھے اپنی آنکھوں اور کانوں پر تو بہر حال یقین کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن حیرت مجھے اب بھی ہے۔"

اسی طرح 1910 کے قریب یہ شرمیلا سا نوجوان، جو اپنا فوٹو کھنچوانے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا۔ کمزور صحت لیکن 'پختہ ارادے والا، سلگتے دل لیکن ٹھنڈے دماغ والا، نفاست کا عادی لیکن فیصلے کا اٹل، بلا کا ذہین مگر نرم مزاج، عظیم ہندستانی سپاہیوں کی اُس فوج میں شامل ہونے کے لیے تیار تھا جو قوم کو آزادی کی طرف لے جانے والی تھی۔

سچ بات تو یہ ہے کہ وہ کتاب کا کیڑا تھے۔ سردیوں کے موسم، تنہائی، موسیقی اور عمدہ چائے کے وہ رسیا تھے۔ وہ صبح بہت سویرے اُٹھنے والے اور وقت کے پابند تھے۔ اپنے پیارے وطن اور اُس کے لوگوں کی خاطر وہ ہر تکلیف کو برداشت کرنے اور ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔

گاندھی جی جنوبی افریقہ میں تھے۔ وہاں بسے ہندستانیوں کے لیے جدوجہد میں مصروف، اُن کے ہونے والے ایک ساتھی، جواہر لال

نہرو، یورپ سے آکر اپنے میدان جنگ یعنی ہندستان کے حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔

اُن کے ہونے والے ایک اور ساتھی مولانا آزاد نے ہندستان میں، آگ لگا دینے والی اپنی تقریروں، زوردار تحریروں اور ہندستان کے پڑھے لکھے مسلمانوں سے رابطہ قائم کرکے، آزادی کے لیے جنگ کی تیاریاں پہلے سے ہی شروع کر دی تھیں۔ بنگال کے ایک انقلابی، شیام سندر چکرورتی سے انھوں نے انقلابی کاموں کی کچھ تربیت بھی لی تھی۔ اور انھیں کے ذریعے عظیم انقلابی اربندو گھوش سے 1905 میں ملے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں میں چند خفیہ کلب بھی قائم کیے تھے۔

مولانا آزاد محسوس کرتے تھے کہ 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد، بعض وجوہات کی بنا پر ہندستان کے مسلمان اپنے دوسرے بھائیوں سے اکثر معاملات میں پیچھے رہ گئے تھے۔ اُن میں سے بہت سے یہ سمجھتے تھے کہ ہندستان پر اب ہمیشہ انگریزوں کا راج رہے گا اس لیے اُن کے خلاف اب لڑنا بے کار ہے۔ لیکن مولانا اخبار میں مضمون لکھ لکھ کر انھیں یہ بتاتے رہے کہ غیر ملکی حکومت کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا نہ صرف ایک قومی تقاضہ ہے بلکہ مذہبی فریضہ بھی ہے۔ ایک مرتبہ اُنھوں نے اعلان کیا ''مسلمانوں کے لیے یہ آسان ہے کہ دو سانپوں اور بچھوؤں کے ساتھ امن سے رہیں۔ پہاڑوں میں جاکر غاروں اور بھنوں میں رہنے لگیں اور جنگلی جانوروں کے ساتھ امن کی زندگی گزاریں لیکن انگریزوں سے صلح کی بھیک مانگنا اُن کے لیے ممکن نہیں ہے۔'' اپنے اس پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے انھوں نے 1912 میں اپنا مشہور ہفتہ وار اخبار الہلال نکالا جو بڑا مقبول ہوا۔

اِتحاد

مولانا شروع سے اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ ہندستان کے لوگ صرف اُسی وقت ایک بڑی قوم بن سکتے ہیں جبکہ اُن میں اِتحاد ہو۔ گاندھی جی کی طرح اُن کے دل کو بھی کوئی چیز اتنی عزیز نہیں تھی جتنی کہ لوگوں میں اِتحاد۔ اور گاندھی جی ہی کی طرح جنھوں نے اپنی زندگی قومی اِتحاد کے لیے قربان کردی، مولانا آزاد بھی قومی اتحاد کے لیے ہر قربانی دینے کے لیے تیار تھے۔

1923 میں اِنڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں اپنے پہلے صدارتی خطبے میں اُنھوں نے کہا "آج اگر کوئی فرشتہ آسمان سے اُتر کر دہلی کے قطب مینار کی بلندی سے اعلان کرے کہ ہندستان کو چوبیس گھنٹے کے اندر سوراجیہ مل جائے گا اگر وہ ہندو مسلم اِتحاد کا خیال چھوڑ دے تو میں ہندو مسلم اِتحاد کے مقابلے میں سوراجیہ کو قبول نہیں کروں گا۔ کیوں کہ اگر سوراجیہ ملنے میں دیر ہوئی تو صرف ہندستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر اتحاد نہ ہو سکا تو دنیا کی پوری اِنسانیت کا نقصان ہوگا۔

بدقسمتی سے کچھ لوگ تھے جو اتحاد نہیں چاہتے تھے۔ یہ لوگ زندگی بھر مولانا آزاد کی شدید مخالفت کرتے رہے۔ ان لوگوں نے اُن کے طرح طرح کے نام رکھے۔ مذاق اڑایا، بُرا بھلا کہا اور طعنے دیے لیکن مولانا نے کبھی اُن کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کیا۔

1924 میں گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کے لیے اکیس دن کچھ نہیں کھایا۔ 'آمرن ان شن برت' رکھا۔ مولانا آزاد تمام قوموں کے لوگوں کے پاس دوڑتے پھرے کہ وہ لڑائی جھگڑا بند کردیں۔ وہ گاندھی جی سے اپنا برت ختم کرنے کی درخواست کرتے رہے۔ اسی طرح گولی لگنے سے کچھ دن پہلے اسی غرض سے گاندھی جی کے برت رکھنے پر وہ 'دیوانہ وار' لوگوں کے پاس دوڑتے پھرے۔

دراصل اپنے وطن اور اُس کے لوگوں سے محبت اور اپنے فرض کا یہ احساس ہی تھا جس نے ایک پڑھنے لکھنے والے شخص، مولانا آزاد، کو اُن کے کتب خانے سے نکال کر وطن کے لاکھوں باسیوں کے درمیان لاکر کھڑا کر دیا۔ وہ یقیناً ایک عجیب و غریب انسان تھے۔ دن بھر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اہم معاملات پر گفتگو کرنے، ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے، وفد کو یہاں وہاں لے جانے یا دن بھر چلنے والے کانگریس کے اجلاس کی صدارت کرنے کے بعد لوگ اُنھیں شام یا آدھی رات کو، خود بنائی ہوئی لطیف چائے کی ایک پیالی سامنے رکھے کسی سنجیدہ، علمی، ادبی، یا مذہبی تحریر میں مصروف پاتے۔ مولانا کو واقعی اپنے ذہن پر کمال کی قدرت حاصل تھی اور وہ اپنے وقت کا بہترین استعمال کر سکتے تھے۔

ہندستان چھوڑو

8/اگست 1942 کی رات میں دیر گئے مولانا آزاد کی صدارت میں 'آل انڈیا کانگریس کمیٹی' کے تاریخی جلسے نے برطانوی حکومت سے ہندستان چھوڑ دینے کو کہا۔ دوسرے دن صبح کو سب بڑے بڑے نیتا ایک اسپیشل ریل گاڑی کے ڈبوں میں سوار تھے۔ گاڑی پونا میں رُکی اور گاندھی جی اور سروجنی نائیڈو کو وہاں اُتارا گیا۔ شام کے وقت مولانا اور اُن کے ساتھیوں کو احمد نگر کے تاریخی قلعے میں لے جایا گیا۔ وہاں سے انھوں نے اپنے دوست کو لکھا "نو مہینے پہلے نینی سینٹرل جیل کے دروازے میرے لیے کھولے گئے تھے اور کل 9/اگست 1942 کو احمد نگر کے پرانے قلعے کا نیا دروازہ میرے پیچھے بند کردیا گیا۔"

اگلے دن انھوں نے لکھا"۔۔۔ یہ چھٹا تجربہ ہے۔۔۔ پچھلی پانچ باریوں کی کل مدت۔۔۔ سب ملا کر۔۔۔ سات سال آٹھ مہینے بنتی ہے۔۔۔ یہ میری موجودہ ترپن سال کی عمر کا ساتواں حصہ ہوتی ہے" چھٹی باری کے آخر (جولائی 1945) میں ان کی قید کی کل مدت دس سال پانچ مہینے ہوئی۔

احمد نگر قلعہ کی جیل ایک چھوٹی اور خاموش جگہ تھی۔ کوئی میٹنگ نہیں۔ بحث و مباحثہ نہیں، جلوس نہیں اور تقریریں نہیں۔ اُن کی پسندیدہ کتابیں بھی وہاں کم تھیں۔

جیل میں ایک شام کو مولانا کے ایک چھوٹے سے کمرے میں ۔۔ گھریلو چڑیوں نے ہلّہ بول دیا۔ چیں چیں کرتی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اُڑتی پھرے جا رہی تھیں۔ مولانا کھدر کا سفید کرتا پائجامہ پہنے، مسلمان مولویوں جیسی مختصر داڑھی رکھے، ہاتھ میں لمبا بانس لیے، پلنگ پر چڑھے، شوشو کرکے اُنھیں بھگانے کی کوشش میں ادھر سے اُدھر کود پھاند رہے تھے۔ چڑیاں بھاگتیں، پھر آجاتیں۔ آخر مولانا تھک گئے اور ہانپتے ہوئے پرانے صوفے پر جا لیٹے۔ کچھ دیر بعد اُٹھ کر انھوں نے اپنی ٹوپی، شیروانی، میز پر رکھی ہوئی چند کتابیں اور کاغذات جھاڑے۔ پلنگ کے نیچے سے جھاڑو نکالی اور ہر جگہ سے دھول، تنکے، اور چڑیوں کی بیٹ سمیٹ کر ایک طرف ڈالی۔ وہ جھاڑو دیتے جاتے اور اردو کے شعر گنگناتے جاتے۔ آخر میں نمٹ کر بولے "آؤ اب دوستی کرلیں۔"

ایک دن شام کی خاموشی میں ہر طرف سے بے خبر وہ لکھنے میں مصروف تھے۔ ایک چڑیا اوپر سے اُتر کر پہلے صوفے پر آکر بیٹھی۔ پھر اُچک کر اُن کی کرسی پر آئی اور آخر میں مولانا کے کندھے پر۔ مولانا نے بغیر گردن گھمائے، بائیں آنکھ کے کونے سے، بڑے پیار سے اُسے دیکھا اور بائیں ہاتھ کی مٹھی کھول دی، جس میں باجرے کے کچھ دانے تھے۔ چڑیا آہستہ آہستہ پھدک کر اُن کی ہتھیلی کے کنارے پر آئی اور ایک ایک دانہ چگنے لگی۔ آخر مولانا کی چڑیوں سے دوستی ہو ہی گئی۔

دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی اور چڑیا پھُر سے اُڑ گئی۔

"اوہ! معاف کیجیے گا مولانا صاحب میں نے آپ کے دوست کو بھگا دیا۔

"کون؟ جواہر لال تشریف لائیے۔"

"آج آپ باغبانی کے لیے نہیں آرہے ہیں؟"

"ہاں۔ ضرور ضرور، کیوں نہیں۔"

اور وہ فوراً جیل کے دوسرے ساتھیوں، سردار ولبھ بھائی پٹیل، آصف علی، پنڈت گووند بلبھ پنت، آچاریہ کرپلانی، ڈاکٹر سید محمود اور جواہر لال نہرو وغیرہ کے ساتھ جا ملے۔

پُرسکون

چند مہینے بعد جیل کا انگریز سپرنٹنڈنٹ، پوری فوجی وردی پہنے آیا اور اُس نے دھیرے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"تشریف لائیے۔"

"یہ آج کا اخبار ہے سر، اِس میں آپ کے لیے ایک اہم خبر ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔" مولانا نے بغیر اُس کی طرف مڑے ہوئے نرمی سے لیکن بھرائی ہوئی آواز میں کہا" برائے مہربانی اسے یہاں چھوڑ جائیے۔"

افسر باہر چلا گیا اور مولانا نے بھاری قدموں سے چل کر اخبار

اُٹھایا۔ کچھ پڑھا اور صوفے پر تقریباً ڈھیر ہو گئے۔ وہ خیالات میں ڈوبے ہوئے اور بڑے افسردہ تھے۔

کچھ دیر بعد جواہر لال اور مولانا میں گفتگو ہو رہی تھی۔ جواہر لال کچھ کہہ رہے تھے اور مولانا سوچ میں ڈوبے ہوئے گردن ہلا رہے تھے۔ آخر سنبھل کر انھوں نے کہا "کچھ بھی ہو جائے میں اِن سے۔۔۔ دیس کے دشمنوں سے۔۔۔ اُس سے ملنے کی بھیک نہیں مانگوں گا۔"

جواہر لال چلے گئے۔ آنکھیں جھکائے، اُداس، مولانا بھاری قدموں سے اپنے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے۔

کچھ دن بعد جواہر لال ہی نے مولانا کو اُن کی بیوی، زلیخا کے انتقال کی خبر سنائی اور جب انھوں نے مولانا سے کچھ ہفتے کے لیے باہر چلے جانے کو کہا اور اصرار کیا تو مولانا نے فیصلہ کن لیکن نرم لہجے میں جواب دیا "میرے بھائی! جو حکومت ہمیں اصلی آزادی دینے کے لیے تیار نہیں، اُس سے چند ہفتوں کی آزادی کی بھیک مانگنے سے کیا فائدہ؟" سوچ میں گم، ذرا دیر رُک کر وہ بولے "اب ہم انشاء اللہ جنت ہی میں ملیں گے۔" بعد میں انھوں نے لکھا کہ اگرچہ اس حادثے سے وہ بالکل ٹوٹ گئے تھے، لیکن انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بہت جلد پُر سکون اور عام دِنوں جیسے لگنے لگے۔ وہ جیل ہی میں تھے کہ اُن کی بڑی بہن کا بھی انتقال ہو گیا۔ انھوں نے لکھا "جیل میں میں نے جو وقت گزارا اُس کا زیادہ حصہ بڑی ذہنی اذیت میں گزرا۔ اس کا میری صحت پر بہت خراب اثر پڑا۔ جب میں گرفتار ہوا تھا تو میرا وزن 170 پونڈ تھا۔ جب میرا تبادلہ (بنگال میں بنکوراکا) ہوا تو میرا وزن گھٹ کر 130 پونڈ رہ گیا تھا۔ میری بھوک ختم ہو گئی تھی۔

تقاضے

اپنی رہائی کے بارے میں وہ لکھتے ہیں: "ہوڑہ کا اسٹیشن انسانوں کا ایک سمندر لگتا تھا۔ جب ہم روانہ ہونے والے تھے تو میں نے دیکھا کہ میری کار کے سامنے ایک بینڈ بجنے لگا۔ میری رہائی کی خوشی میں۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا اور میں نے کہا کہ خوشی منانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ میرے ہزاروں دوست اور ساتھی اب بھی جیل میں ہیں۔"

راستے میں تین سال پہلے کلکتے سے روانگی کی یادیں اُنھیں آئیں "میری بیوی مجھے الوداع کہنے دروازے تک آئی تھیں، اب میں تین سال بعد لوٹ رہا ہوں لیکن وہ اپنی قبر میں ہیں اور میرا گھر خالی ہے۔۔۔ میری کار پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی تھی ایک ہار میں نے اُٹھا کر اُن کی قبر پر رکھ دیا اور خاموشی سے فاتحہ پڑھی۔"

سیاست میں ایک بار داخل ہونے کے بعد مولانا نے تمام ذمّے داریوں اور تقاضوں کو خوشی سے پورا کیا۔ تین بار وہ کانگریس کے صدر بنے۔ 1923 میں کانگریس کے سب سے کم عمر صدر بننے کے علاوہ آخری بار انھوں نے 1940 سے 1946 تک چھ برس کانگریس کی قیادت کی۔ آزادی سے پہلے یہ صدارت نہ صرف سب سے زیادہ طویل مدّت کی تھی بلکہ یہ ہی زمانہ اُس کی تاریخ میں سب سے مشکل دور بھی تھا۔ مولانا نے لکھا "میں نے محسوس کیا کہ اگر میں نے پھر انکار کیا تو میں گویا اپنے فرائض سے منہ موڑوں گا۔ جب گاندھی جی نے مجھ سے صدر بن جانے کے لیے کہا تو میں فوراً راضی ہو گیا۔"

دوسری عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی اور ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ ہمارا ملک اب آزادی کی دہلیز تک آپہنچا ہے۔ ہمارے ملک کی ان برسوں کی تاریخ بہت ولولہ انگیز ہے۔

1942 میں کرپس مشن ہندستان آیا۔ ہندستان کی آزادی اور لڑائی میں برطانیہ کی امداد کے بارے میں بات کرنے۔ یہ مشن ناکام رہا، ہندستان چھوڑو، تحریک کے زمانے میں جو 8/اگست 1942 کو شروع ہوئی تھی۔ ہزاروں مرد اور عورتیں اور سارے بڑے بڑے لیڈر جیل گئے اور مصیبتیں جھیلیں۔ جنگ کے بعد مارچ 1946 میں ایک 'کیبنیٹ مشن' ہندستان آیا اُس کی ایک تجویز پر کانگریس نے انتخابات میں حصہ لیا اور مرکزی اور زیادہ تر صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں اکثریت حاصل کی۔

ایک عارضی حکومت بنی۔ مولانا آزاد نے نہ صرف کانگریس کے صدر بلکہ ایک بڑے قومی رہنما کی حیثیت سے بہت محنت سے کام کیا اور دوسروں کے ساتھ مل کر ایک انتہائی مشکل وقت میں ملک کی رہنمائی کی۔ دراصل کانگریس کے لوگ چاہتے تھے کہ اگلی بار پھر وہی کانگریس

کے صدر رہیں لیکن انھوں نے جواہر لال نہرو کا نام پیش کیا۔ نہرو جی کے الفاظ میں "بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ چاہے وہ صدر رہے ہوں یا صرف ورکنگ کمیٹی کے ممبر، کانگریس کی تاریخ اور ملک کی تاریخ میں، تجاویز اور پالیسیوں کے مرتب کرنے میں کتنا اہم رول وہ ادا کرتے رہے۔"

قومی رہنماؤں میں مولانا اپنی ایک اور خوبی کی وجہ سے بھی یاد کیے جاتے تھے۔ جب کبھی کانگریس کے لوگوں میں اختلاف رائے ہوتا تو یہ ہی اُن کو پھر ایک دوسرے سے قریب لاتے۔ کیوں کہ ہر شخص اُن کی عزت کرتا تھا۔

کئی سال سے مولانا کی یہ خواہش تھی کہ وہ اپنی آخری عمر علمی کاموں میں صرف کریں جو ان کا سب سے محبوب مشغلہ تھا۔ احمد نگر سے رہا ہونے کے بعد پنڈت نہرو نے بھی اُن سے کہا تھا کہ وہ کانگریس کا کوئی جلسہ ابھی نہ بلائیں۔ کیوں کہ وہ بھی کچھ آرام کر کے اپنی کتاب مکمل کرنا چاہتے تھے لیکن، مولانا نے لکھا "مجھے اُس وقت معلوم نہ تھا کہ جب ہم رہا کیے جائیں گے تو اپنی باقی ساری عمر ہمارے لیے آرام کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔"

چند دن بعد ہی جواہر لال اور مولانا دونوں کو شملہ کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے جانا پڑا۔ مولانا کا علاج کرنے والے ڈاکٹر کانفرنس کو دو ہفتے کے لیے ملتوی کرانا چاہتے تھے۔ لیکن مولانا راضی نہ ہوئے۔ اُن کی حالت کو دیکھتے ہوئے وائسرائے لارڈ ویول نے اُن کے رہنے کا انتظام قریب ہی کرا دیا اور اپنے ذاتی اسٹاف میں سے کچھ کو مولانا کی دیکھ ریکھ کے لیے مقرر کر دیا۔ فرائض کی پابندی کرنے کے بارے میں مولانا نے ایک مرتبہ اپنے دوست کو لکھا تھا "فوجی خدمات بجالانے سے انکار کر دینا کوئی جرم نہیں ہے۔ لیکن سپاہی بن جانے کے بعد میدانِ جنگ سے بھاگ لینا۔ اس کی سزا موت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔" وہ یقیناً ہماری جنگِ آزادی کے سب سے بہادر سپاہی تھے۔

آزادی مل گئی

15/اگست 1947 کو ہندستان آزاد ہوا۔ مہاتما گاندھی، نہرو، پٹیل، مولانا اور دوسرے بڑے رہنماؤں نے دُکھتے دل سے اِس کا استقبال کیا، کیوں کہ متحدہ ہندستان کا اُن کا خواب پورا نہیں ہوا تھا۔ ملک تقسیم ہو گیا۔ لیکن اطمینان کا سانس لیے بغیر وہ نئے ہندستان کی تعمیر کے کام میں فوراً جُٹ گئے۔ قوم کے محبوب، ہمارے پہلے وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو نے کہا "آدھی رات کا گھنٹہ بجنے پر ہندستان بیدار ہوگا۔ زندہ اور آزاد۔ اس سنجیدہ لمحے میں اپنے ملک اور اُس کے لوگوں کی خدمت میں لگ جانے کا ہم عہد کرتے ہیں۔ بس اب اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لیے ہمیں محنت کرنی ہے اور کام کرنا ہے۔"

اپنی خراب صحت اور قلم اور کتاب پھر سے اُٹھا لینے کی اپنی خواہش کے باوجود مولانا آزاد نے بھی نئی ذمے داریوں کو منظور کر لیا۔

ہندستان کے پہلے وزیر برائے تعلیم، تمدن اور فنونِ لطیفہ کی حیثیت سے وہ ایک ایسی تعلیم کو رائج کرنا چاہتے تھے جو ہندستانیوں میں ایک نیا ذہن پیدا کر سکے۔ اُنھوں نے نہ صرف اسکول، کالج، اور یونی ورسٹیاں قائم کیں بلکہ ہندستان کے عظیم تمدن کو نئی زندگی عطا کرنے کے لیے، ساہتیہ اکاڈمی، سنگیت ناٹک اکادی، للت کلا اکاڈمی اور انڈین کونسل برائے تمدنی تعلقات جیسے اہم ادارے بھی قائم کیے۔

اپنی زندگی کے آخری دن تک وہ جواہر لال نہرو کے قریبی دوست اور ساتھی، بھروسے کے قابل صلاح کار اور سب سے مضبوط حمایت کرنے والے رہے۔

22/فروری 1958 کو ہماری قومی البم کا ایک رنگین ورق الٹ گیا۔ مختلف لوگ، ایک مذہبی رہنما، مصنف، اخبار نویس، شاعر، مقرر، سیاست داں، اور منتظم کے روپ میں ہندستان کے اس عظیم سپوت کو اپنے اپنے طور پر یاد کریں گے۔ لیکن سب سے بڑھ کر مولانا آزاد، ہندستان کے اُن لوگوں میں سے تھے جو پکے مذہبی ہوتے ہوئے بھی ہندستان کے سچے سیکولر تمدن کی رہنمائی کرتے رہے۔

□□□

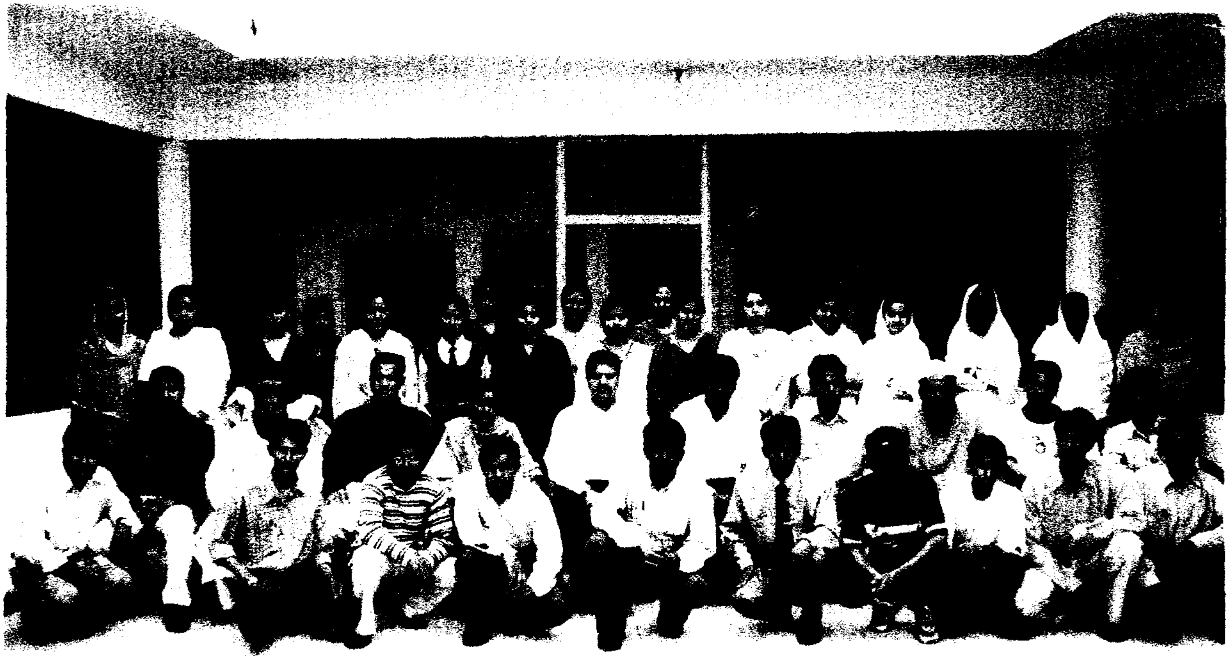

قومی اردو کونسل کے مرکز ایم. پی. سہارا ایجوکیشن سوسائٹی، بھوپال کے معائنے کے دوران قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ طلبہ کے ساتھ۔

URDU DUNIYA Monthly, JANUARY 2003, Vol. 5, Issue: 1
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India, New Delhi

قومی اردو کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ اور بچوں کا ادبی ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کی ذہنی تربیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔ 'ہمارے رہنما' سیریز کی آٹھ جلدوں میں ان رہنماؤں کے حالات زندگی اور کارناموں سے بے حد عام فہم انداز میں واقف کرایا گیا ہے، جنھوں نے ہمارے ملک کو آزاد کرانے اور اسے ترقی یافتہ و خوش حال بنانے میں اہم رول ادا کیا۔

ہمارے رہنما (جلد اوّل)

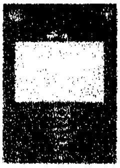

اس جلد میں بنکم چندر چٹرجی، اینی بیسنٹ، بھیکا جی کاما، سروجنی نائیڈو، مولانا ابوالکلام آزاد، سی وی رمن، کملا نہرو اور لال بہادر شاستری کی داستان حیات پیش کی گئی ہے۔

مترجم اقبال مہدی زیدی

صفحات 149، قیمت -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد دوم)

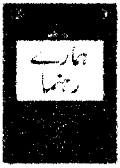

اس جلد میں [illegible] صاحب کا [illegible] [illegible] بھائی پٹیل، سر [illegible] صادق اور [illegible] سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم [illegible]

صفحات 172، قیمت -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد سوم)

اس جلد میں راجا رام موہن رائے، ایشور چندر [illegible]، سریندر ناتھ بنرجی، وی او چدمبرم پلائی، سری نواسا راما نجن، سر [illegible]، رام کرشن [illegible] امرت کور اور جے پرکاش نرائن سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم نظام حیدر

صفحات 192، قیمت -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد چہارم)

اس جلد میں [illegible] سوامی [illegible] ٹیگور، [illegible] اور [illegible] سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم نظام حیدر

صفحات 108، قیمت -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد پنجم)

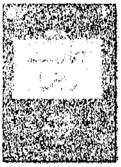

اس جلد میں گوپال کرشن گوکھلے، وی ایس سری نواسا شاستری، خان عبدالغفار خاں اور سکھ دیو سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم رفیق محمد شاستری

صفحات 107، قیمت -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد ششم)

اس جلد میں دادا بھائی نوروجی، چترنجن داس، راش بہاری بوس، ستیہ مورتی، بی آر امبیڈکر اور کملا دیوی چٹوپادھیائے سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم محمد عمر برنی

صفحات 128، قیمت -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد ہفتم)

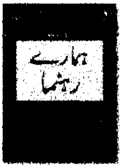

اس جلد میں مہادیو گووند راناڈے، محمد اقبال، بھولا بھائی ڈیسائی، پدھان چندر رائے، وناٹک دامودر ساورکر اور کے کامراج سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم فرحت قمر

صفحات 149، قیمت -/35 روپے

ہمارے رہنما (جلد ہشتم)

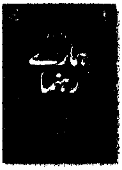

اس جلد میں بپن چندر پال، جگدیش چندر بوس، کستوربا گاندھی، وٹھل بھائی پٹیل، رفیع احمد قدوائی، ونوبا بھاوے، شیاما پرساد مکرجی اور جے آر ڈی جہانگیر بھابھا سے متعارف کرایا گیا ہے۔

مترجم حیدر نقوی

صفحات 161، قیمت -/35 روپے